Regd. L. No.7243 Phone

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

دسمبر 1979

بیادِ علامہ اسلم جیراجپوری رحہ

۱ ۔ اسلامی نظام

۲ ۔ قانونِ وراثت

شائع کردہ: ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان ۳۶/- روپے
غیر ممالک ۳/- پونڈ

ٹیلیفون نمبر ــــــ ۸۸۰۸۰۰
خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ
۳
تین روپے

جلد ۳۲	دسمبر ۱۹۷۹ء	شمارہ ۱۲

فہرست

۱۔ لمعات ـــــــــــــــــــ ۲
۲۔ "مطالب الفرقان" (جلد سوم) ـــــــــــــــــــ ۱۲
۳۔ مولانا غلام مرشد علیہ الرحمۃ ـــــ (محترم قاضی دین الحق) ـــــ ۱۳
۴۔ بیادِ علامہ اسلم جیراجپوری (۱) اسلامی نظام ـــــــــــــــــــ ۱۸
(۲) قانونِ وراثت ـــــــــــــــــــ ۲۸
۵۔ مسئلہ تعلیم کی اہمیت ـــــ (محترم محمد اسلام صاحب) ـــــ ۳۱
۶۔ یتیم پوتے کی وراثت ـــــ (محترم پرویز صاحب) ـــــ ۵۴
۷۔ درسِ قرآن کے اعلانات ـــــــــــــــــــ ۵۸
۸۔ روس کے بعد چین کی ناکامی ـــــــــــــــــــ ۵۹
۹۔ نقد و نظر (اُجالا) ـــــــــــــــــــ ۶۳
۱۰۔ تعزیت (ڈاکٹر رضا محمد خان مرحوم) ـــــــــــــــــــ ۶۴

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد۔ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

سورۃ الکہف کی آخری آیات میں ایک عظیم فکر انگیز حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کہا کہ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا "کیا ہم تمہیں بتائیں کہ وہ کون لوگ ہیں جو کام تو بہت کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود سخت نقصان میں رہتے ہیں"۔ یہ وہ لوگ ہیں: هُمُ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا "جو اس خیال میں مگن رہتے ہیں کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں"۔ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ "لیکن ان کے کام کوئی نتیجہ مرتب نہیں کرتے۔ سب رائیگاں جاتے ہیں" (۱۸/۱۰۳-۱۰۵)۔

ان آیات میں پہلا غور طلب نکتہ یہ ہے کہ یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ سب سے زیادہ نقصان میں وہ لوگ رہتے ہیں جو کچھ کام نہیں کرتے۔ کہا یہ گیا ہے کہ کام تو وہ کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود سخت نقصان میں رہتے ہیں۔ دوسرا توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ یہ منافقین بھی نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نہایت نیک نیتی سے سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھے کام سرانجام دے رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے کام مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کرتے اس لئے وہ رائیگاں چلے جاتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ جن لوگوں کی کوششیں مطلوبہ نتائج پیدا نہ کریں وہ سب سے زیادہ نقصان میں رہتے ہیں۔ سوچئے! کہ یہ امر کس قدر عبرت آموز اور تاسف انگیز ہے کہ کوئی شخص نہایت نیک نیتی سے جان مار کر کام کرے لیکن اس کے باوجود انجام کار سخت خسارے میں رہے۔ اس نقصان سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ کھڑے ہو کر سوچا جائے کہ جو کام ہم کر رہے ہیں وہ مطلوبہ نتائج بھی پیدا کرتا ہے؟ اور اس کے لئے یہ طے کرنا لاینفک ہے کہ یہ متعین طور پر معلوم ہو کہ وہ نتیجہ کیا ہے جو اس کام سے مطلوب ہے۔

ہماری تاریخ میں اس قسم کے ضبطِ اعمال کی بکثرت مثالیں ملیں گی لیکن ہمیں اس کے لئے ماضی میں جانے کی ضرورت نہیں جو کچھ ہمارے ہاں آج کل ہو رہا ہے وہ اس کی زندہ مثال ہے۔ "ہمارے ہاں" سے مراد کم و بیش تمام مسلم ممالک ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کچھ عرصے سے مسلم ممالک میں "اسلام کے احیاء" کی تحریک بڑی شدّ و مد سے جاری ہے۔ پاکستان اس میں پیش پیش ہے۔ اس مقصد کے لئے بڑی بڑی بلند پایہ کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں۔ بین الملّی سیمینارز کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ وسیع پیمانوں پر مذاکرے ہوتے ہیں جن میں لمبی چوڑی تقریریں ہوتی ہیں۔ مبسوط مقالات پڑھے جاتے ہیں۔ خطابات پیش کئے جاتے ہیں۔ مختلف کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ کمیشن بٹھائے

جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ کئی برسوں سے ہو رہا ہے۔ اس پر بیش بہا وقت، توانائی اور روپیہ صرف کیا جا رہا ہے لیکن آپ سوچیئے کہ اس سب کے باوجود اس مقصد کی طرف ایک قدم بھی آگے بڑھا ہے جس کے حصول کے لئے یہ ساری تگ و تاز کی جا رہی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مختلف مسلم ممالک ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں۔ ہم اسے تسلیم کئے لیتے ہیں (اگرچہ یہ قرب بھی وقتی، ہنگامی اور سطحی سا ہوتا ہے) لیکن اس تگ و تاز کا مقصد یہ نہیں، مقصد احیاءِ اسلام ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس مقصد کی طرف ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا۔ جب یہ حقیقت ہے تو کیا اس کی ضرورت نہیں کہ ہم کھڑے ہو کر سوچیں کہ اس کی وجہ کیا ہے؟

اس کی وجہ بالکل واضح ہے بشرطیکہ ہم کبوتر کی طرح اپنی آنکھیں بند نہ کئے رکھیں۔ اس تمام سعی و کاوش کا مقصد احیاءِ اسلام بتایا جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسلام کا کوئی متفق علیہ اور متعین مفہوم بھی ہمارے ذہنوں میں ہے۔ اس سوال کا جواب بڑی آسانی سے مل سکتا ہے۔ آپ ایسا کیجئے کہ اب کے جو کانفرنس منعقد ہو آپ اس کے شرکاء میں ایک ایک سادہ ورق تقسیم کر دیجئے اور ان سے کہیئے کہ وہ ان اوراق پہ لکھ دیں کہ ان کے نزدیک اسلام کا مفہوم کیا ہے؟ آپ کو جو جوابات ملیں گے ان سے آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر مبہم ہوں گے ـــــ یعنی ایسے الفاظ اور اصطلاحات کا مجموعہ جو ہمارے ہاں عام طور پہ رائج ہیں لیکن جن کا کوئی مفہوم متعین نہیں ـــــ اسلام رضاجوئی باری تعالیٰ کا نام ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے۔ اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اسلام احکامِ شریعت کے مطابق عمل کرنے کا نام ہے۔ اسلام قربِ خداوندی کا ذریعہ اور نجات و سعادت کا ضامن ہے۔ وغیرہ وغیرہ ـــــ جو جوابات ایسے الفاظ میں دیئے گئے ہوں جن کے معانی واضح ہوں آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے کسی ایک کا جواب دوسرے سے نہیں ملے گا۔ اس کا تجربہ منیر کمیٹی میں کیا جا چکا ہے۔ اس میں ہمارے علماءِ کرام سے پوچھا گیا تھا کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر نے تو یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیا تھا کہ اس جواب کے لئے کافی وقت درکار ہے۔ جنہوں نے جواب دیا تھا ان میں سے کسی ایک کا جواب دوسرے سے نہیں ملتا تھا۔ وہ رپورٹ آج بھی مطبوعہ شکل میں محفوظ ہے جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ ان تمام دلائل و شواہد سے بڑھ کر ارشادِ باری تعالیٰ اس باب میں قولِ فیصل ہے۔ اس نے فرمایا ہے۔ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ ..... فِيْهِ (۴۲/۱۳) "اللہ نے جو دین تمہارے لئے متعین اور واضح کیا ہے وہی ہے جسے اس نے نوحؑ۔ ابراہیمؑ۔ موسیٰؑ۔ عیسیٰؑ (اور دیگر انبیاءؑ) کی طرف وحی کیا تھا۔ ان سب سے یہی کہا گیا تھا کہ وہ خدا کے متعین فرمودہ دین کو قائم کریں اور اس میں تفرقہ پیدا نہ کریں۔" یعنی یہی نہیں کہ جو دین مسلمانوں کو دیا گیا ہے اس میں تفرقہ کی گنجائش نہیں بلکہ دینِ شروع سے آخر تک ایک ہی چلا آیا ہے۔ اس لئے الدین میں اختلاف اور افتراق نہیں ہو سکتا۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ پاکستان تک محدود نہیں۔ تمام مسلم ممالک کی یہی حالت ہے۔ ایک ملک کے اندر اسلام کے مختلف علمبرداروں کی یہی کیفیت ہے اور مختلف ممالک کے مسلمانوں کی بھی یہی حالت۔ سو جب حالت یہ ہے کہ اسلام کے نام لیواؤں کے ذہن میں اسلام کا کوئی متفق علیہ، متعین مفہوم ہی نہیں تو احیاءِ اسلام کی کوششوں کا مطلب کیا ہوگا؟ اور یہ کس طرح نتیجہ خیز ہو سکیں گی؟ ہمیں کسی کی نیت پر شبہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ ان سب کی نیت بخیر ہے۔ وہ دل سے احیاءِ اسلام کے خواہاں ہیں۔ لیکن واضح

متفق علیہ اور متعین نصب العین کے بغیر محض حُسنِ نیت تو کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔ اس کی شہادت قرآن مجید کی وہ آیات دے رہی ہیں جنہیں شروع درج کیا گیا ہے۔ احیاءِ اسلام کے نہایت مبارک مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے والوں کی خدمت میں ہم گزارش کریں گے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ "اسلام کیا ہے" کے سوال کا غیر مبہم اور غیر اصطلاحی الفاظ میں جواب متعین کیا جائے اور پھر مختلف مسلم ممالک سے پوچھا جائے کہ وہاں کے "مسلمان باشندے اس جواب سے متفق ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ بھی بتایا جائے کہ اس جواب کے صحیح ہونے کی سند کیا ہے۔ جب یہ بنیادی نقطہ طے پا جائے تو پھر اُس اسلام کے احیاء کے لئے عملی قدم اٹھایا جائے۔ اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً دیکھا اور پرکھا جائے کہ ہم اس نصب العین کے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں یا نہیں۔ احیاءِ اسلام کی کوششوں کے نتیجہ خیز ہونے کی یہی ایک شکل ہے۔ اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو ہماری کوششوں کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ ہم اپنے دل کو جھوٹی تسلی دے لیں کہ ہم بڑا نیک کام کر رہے ہیں، ان لوگوں کی طرح جن کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے: وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا اور نتیجہ اس کا: فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ اور انجام کار: أَخْسَرِينَ أَعْمَالًا۔

☆

اسلام کے مفہوم کے عدم تعین کی وجہ سے کوششیں کس طرح رائیگاں جاتی ہیں، اس کی دوسری شہادت ہمارے ہاں اسلامی قوانین کے مرتب کرنے کی سعی لاحاصل ہے۔ تشکیلِ پاکستان کے تھوڑے ہی عرصے بعد ملک کے چوٹی کے علماء حضرات نے یہ قرار داد منظور کی کہ مملکت کے قوانین "کتاب و سنّت" کے مطابق مرتب کئے جائیں اور اس کے بعد ڈھنڈورا یہ پیٹا گیا کہ اس مطالبہ میں کوئی اختلاف نہیں۔ تمام فرقوں کے نمائندے اس پر متفق ہیں۔ ہم نے کہا کہ ان الفاظ پر تو بے شک سب متفق ہیں لیکن ان کا مفہوم ہر فرقہ کے نزدیک الگ الگ ہے۔ اور یہ حقیقت بالکل واضح ہے۔ ان فرقوں کے فقہی قوانین الگ الگ ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کے قوانین سنتِ نبویؐ پر مبنی ہیں۔ اور چونکہ وہ سنتِ رسول اللہؐ پر مبنی ہیں اس لئے ان میں ردّ و بدل نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ جو قوانین مختلف ہوں اور ان میں ردّ و بدل بھی نہ کیا جا سکتا ہو ان کی بنیادوں پر کوئی ایسا مشترکہ ضابطۂ قوانین بنایا نہیں جا سکتا جس پر تمام فرقے متفق ہو جائیں۔ یہ حقیقت ایسی بدیہی تھی کہ آخر الامر ان حضرات کو اس کا اعتراف کرنا پڑا لیکن اس اعتراف اور اعلان کے باوجود مطالبہ یہی رہا کہ کتاب و سنت کے مطابق اسلامی قوانین مرتب کئے جائیں۔ اس ضمن میں اس وقت تک جتنی کوششیں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں وہ حبطِ اعمال کی زندہ شہادت ہیں۔ اس مقصد کے لئے چودہ پندرہ سال سے ایک اسلامی نظریاتی کونسل قائم ہے۔ اس عظیم الجثہ ادارہ کے ساتھ ایک اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بھی مصروفِ تحقیق ہے۔ ان اداروں پر جو کچھ خرچ ہوا ہے اور انہوں نے جو کچھ آج تک کیا ہے اور اس کا جو نتیجہ مرتب ہوا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے حبطِ اعمال کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اب بڑے پیمانے پر ایک لاء کمیشن مقرر کیا گیا ہے جس کا یہی مقصد ہے۔ اس کے علاوہ مختلف ہائی کورٹوں میں شریعت بنچ بھی

قائم کیے گئے ہیں۔ لیکن جس طرح ہم نے برسوں پہلے کہا تھا اسے پھر دہراتے ہیں کہ یہ کوششیں بھی رائیگاں جائیں گی۔ ان سے بھی مملکت کا کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جسے مملکت کے تمام مسلمان باشندے اسلامی تسلیم کر لیں۔

اس کی وجہ وہی ہے جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ جب تک یہ متعین نہ کیا جائے کہ اسلامی کہتے کسے ہیں اور اس مفہوم کے اسلامی ہونے کی سند کیا ہے اس وقت تک "اسلامی" کا لفظ ہی بے معنے ہوگا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، الدین میں اختلاف اور تفرقہ ہو نہیں سکتا اور اسی طرح مملکت کے پبلک لاز کا ضابطہ بھی بلا اختلاف اور افتراق ہونا چاہیئے۔ اختلافات کو عملی حالہ رکھتے ہوئے ایک متفق علیہ ضابطہ کی تدوین کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی ہے! اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی کوششیں کرنے والوں کو "اَلْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا" (سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے) کیوں کہا ہے۔ ہمارے ہاں جب تک قوانین کو "اسلامی" بنانے کی کوششیں شروع نہیں ہوئی تھیں مختلف فرقوں کے اختلافات محض نظری تھے لیکن ان کوششوں کے بعد یہ نظری اختلافات عملی شکل اختیار کر رہے ہیں اور اعلانیہ کہا جا رہا ہے کہ اگر ان قوانین کو ان لوگوں پر مسلط کرنے کی کوشش کی گئی جو انہیں اسلامی تسلیم نہیں کرتے تو وہ ان کی خلاف ورزی کے لئے عملی قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔

اس مقام پر ہمیں ایک دلچسپ بات یاد آ رہی ہے۔ پچھلے دنوں جو بین الملی اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں ایک تجویز یہ بھی پاس ہوئی تھی کہ ایک قانونی کمیشن مقرر کیا جائے جو تمام عالمِ اسلام کے لئے واحد مشترک اسلامی قوانین کا ضابطہ مرتب کرے۔ یعنی ایک مملکت (پاکستان) میں متفق علیہ اسلامی ضابطۂ قوانین مرتب کرنے میں جو دشواریاں پیش آ رہی ہیں ان کا تو کوئی حل نظر نہیں آتا اور تجویز یہ کی گئی ہے کہ تمام عالم اسلام کے لئے واحد اسلامی ضابطۂ قوانین مرتب کیا جائے۔ ہم ان حضرات کی خدمت میں اس سے زیادہ کیا عرض کر سکتے ہیں کہ

اے کہ می جوئی نظامِ عالمے جستہ اورا اساسِ محکمے؟

"اساسِ محکم" دریافت کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ متعین کیا جائے کہ "اسلامی" کسے کہتے ہیں اور اس کی سند کیا ہے۔ جب تک یہ طے نہیں ہو جاتا آپ کی کوئی کوشش نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ یاد رکھیئے! جب تک کوئی قوم حقائق (FACTS) کا سامنا نہیں کرتی اور اپنے آپ کو خوش فہمیوں میں مبتلا رکھتی ہے، اس کی کوئی کوشش نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ ہماری ناکامیوں اور نامرادیوں کا بنیادی سبب یہی ہے۔ اسلام کو ہم چھوڑ نہیں سکتے (اور کون کم بخت اسے چھوڑنے کا تصور بھی کر سکتا ہے!) اور اسلام کا مفہوم متعین کرنے کی ہم جرأت نہیں کرتے کیونکہ اس سے ہمیں وہ بہت کچھ چھوڑنا پڑتا ہے جسے ہم اپنی خوش فہمیوں کی بنا پر اسلامی سمجھے ہوئے ہیں) نتیجہ اس کا حبطِ اعمال کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔

☆

ہمارے ہاں آج کل اسلامی قوانین سے آگے بڑھ کر اسلامی نظام کے مسئلہ نے بھی خاصی اہمیت حاصل کر رکھی ہے۔ "نظامِ مصطفیٰ" کے زمانے میں تو "نظام" کا لفظ محیط کل تھا۔ یعنی کہا یہ جاتا تھا کہ یہ نظام (جس کا کوئی مفہوم متعین طور پر نہیں بتایا گیا تھا) زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی گوشوں کو اپنے دائرے میں لئے ہوگا۔ لیکن اب

اسلامی نظام سمٹ کر تشکیلِ حکومت سے متعلق جزئیات تک محدود ہو رہا ہے۔ یعنی یہ کہ انتخابات کی شکل کیسے ہوگی، اسلامی مشاورتی نظام کسے کہا جائے گا، نظام پالیمانی ہوگا یا صدارتی، اولی الامر یعنی امیرالمؤمنین کیسے مقرر کیا جائے گا۔ اس کے اختیارات کا دائرہ کیا ہوگا، عدلیہ کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ اور ہر اس گوشے میں بھی یہی ہو رہا ہے کہ

ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں

بالفاظِ صریح، اس اُلجھی ہوئی ڈور کا سرا یہ ہے کہ "اسلام" کا متفق علیہ مفہوم متعین اور واضح کیا جائے۔ جب یہ ہو جائے گا تو تمام اُلجھنیں دُور ہو جائیں گی اور جو مسائل اس وقت اِس قدر لاینحل دکھائی دے رہے ہیں ان سب کا حل مل جائے گا۔

****

تشتت و انتشار کے اس یاس انگیز ماحول میں اُمید کی ایک کرن صدرِ مملکت پاکستان کے اس پیغام میں دکھائی دی جو انہوں نے علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کے یوم پیدائش کی تقریب پر، قوم کے نام نشر کیا۔ اس میں انہوں نے کہا:-

> پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے سیاسی نظام اور قومی زندگی کے دوسرے شعبوں کا (گہری نظر سے جائزہ لیں)۔ اس مقصد کے حصول کے لئے علامہ اقبالؒ کی فکر میں ہمیں راہنمائی مل سکتی ہے۔ انہوں نے مغربی نظامِ حکومت اور جمہوریت کے تصور پر بار بار تنقید کی ہے اور اسلامی تصورات کو اختیار کرنے کی تاکید اور تلقین۔ ان کا کلام ان اشعار سے بھرا پڑا ہے جن میں انہوں نے مغربی فکر کی تنقیص کی ہے اور جو اسلامی اقدار کے ساتھ ان کے عشق کے آئینہ دار ہیں۔ ہماری بنیادی قومی ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے اس ملی شاعر اور مفکر کی فکر کی روشنی میں اپنا راستہ متعین کریں۔
>
> (پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۹ نومبر ۱۹۹۹ء)

یوں تو رسمی طور پر اس قسم کے الفاظ تو ہم تیس برس سے مسلسل سُنتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن مایوسیوں کی ان تاریکیوں میں ایک صدرِ مملکت کی زبان سے یہ الفاظ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے، طلوعِ اسلام ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبالؒ کی یاد میں جاری ہوا اور اس کا مقصد قرآن کریم کی روشنی میں فکرِ اقبالؒ کو عام کرنا تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے دور میں اور تشکیل پاکستان کے بعد آج تک یہ مسلسل اور متواتر اسی پیغام کو عام کئے چلا جا رہا ہے۔ اس نے فکرِ اقبالؒ اور پیامِ قرآن مجید کے متعلق جو کچھ شائع کیا ہے اگر اسے ایک پلڑے میں اور ملک کے دوسرے گوشوں میں اس باب میں جو کچھ کہا گیا ہے اُسے دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو ہم پورے یقین کے ساتھ (لیکن بصد انکسار) کہہ سکتے ہیں کہ اس کا پلڑا بھاری رہے گا۔ یہ پاکستان اور اسلام کے خلاف بہت بڑی سازش تھی کہ مسلسل پروپیگنڈے سے طلوعِ اسلام کو ایسا نکو بنا دیا گیا کہ اس کی آواز کوئی سُننے نہ پائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا اور فکرِ اقبالؒ اور پیامِ قرآن کو عام ہونے دیا جاتا تو یہ مملکت کبھی کی اسلامی بن چکی ہوتی۔ اقبالؒ نے اپنی فراستِ قرآنی کی رُو سے نہ صرف مملکتِ پاکستان کا تصور دیا تھا بلکہ قرآنی مملکت کے بنیادی خط و خال اور اصول تضمنات کو اس شرح و بسط سے واضح کر دیا تھا کہ انہیں سمجھنے اور ان کے مطابق اسلامی مملکت کے قائم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ سکتی تھی۔ ہم اس اجمال کی تفصیلات گزشتہ

تیس برس سے پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن اس وقت ہم قلتِ گنجائش کی وجہ سے ان تفصیلات کو دہرا نہیں سکتے۔ ذیل کی سطور میں ان کا ایک سرسری سا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد عندالضرورت ان تفصیلات کو بالتکرار بھی سامنے لایا جائے گا۔ تصورِ اقبال کی رو سے اسلامی مملکت کے حدود اور قیود ذیل کی سطور میں ملاحظہ فرمائیے۔

حضرات انبیاء کرامؑ کو خدا کی طرف سے ایک ضابطۂ قوانین و آئین عطا ہوتا تھا۔ جو قوم اس ضابطہ کی صداقت کو تسلیم کر لیتی تھی اس کا فریضہ ہوتا تھا کہ وہ اسے عملاً نافذ کرے۔ چونکہ یہ پوری قوم ایک ضابطے کے تابع زندگی بسر کرتی تھی اس لئے اس میں کسی قسم کے اختلاف اور تفرقہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

رسولؐ کے چلے جانے کے بعد، وہ قوم اس ضابطہ میں آمیزشیں کر دیتی اور اس طرح ان میں اختلافات نمودار ہو جاتے۔ اس طرح وہ دین، مذہب بن جاتا تھا۔ یہ جو دنیا میں مختلف مذاہب پائے جاتے ہیں، یوں سمجھئے کہ یہ دین میں پیدا شدہ مختلف فرقے ہیں، کیونکہ دین تو شروع سے آخر تک ایک ہی تھا۔ دین کی اطاعت کرنے والوں میں فرقے پیدا ہو ہی نہیں سکتے۔

یہ دین آخری مرتبہ، مکمل اور غیر متبدل شکل میں نبی اکرمؐ کی وساطت سے ملا۔ جن سعادت مند افراد نے اس کی صداقت کو تسلیم کر لیا وہ ایک قوم (یا اُمت) بن گئے۔ اس اُمت نے، اس دین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے ایک مملکت کی تشکیل کی جس کا ضابطۂ آئین قرآنِ کریم تھا۔ اس مملکت کی مرکزی اتھارٹی اُمت کے مشورہ سے اس دین پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق وضع کرتی اور انہیں قوانینِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کرتی۔ ان کا اطلاق تمام اُمت پر یکساں طور پر ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس نظام میں، اُمت میں مختلف فرقوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ مختلف فرقوں کے معنی تو یہ تھے کہ مختلف گروہ، مملکت کی طرف سے نافذ کردہ قوانین کے بجائے، اپنے اپنے وضع کردہ قوانین کی اطاعت کرتے۔ ایک مملکت کے اندر رہتے ہوئے اس قسم کا طرزِ عمل تو مملکت سے بغاوت کے مرادف ہوتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ (۳۰/۳۲) یعنی ایک اتھارٹی (حکومتِ قرآنی) کی اطاعت کرنے کے بجائے، مختلف اتھارٹیز کی اطاعت کرنا۔ رسول اللہؐ سے فرمایا گیا کہ جو لوگ فرقے پیدا کر لیں تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا۔ (۶/۱۵۹) یعنی جو مملکتِ اسلامیہ کی مرکزی حیثیت ہی کو تسلیم نہ کریں، ان کا اس مرکز سے تعلق کیا؟ وہ تو اس کے باغی قرار پاتے ہیں۔ چونکہ مرکزِ ملت کے فیصلے قرآن کے مطابق ہوتے تھے، اور فرقوں میں فیصلے اپنی اپنی فقہ کے مطابق ہوتے ہیں، اس لئے کہہ دیا کہ جو لوگ ——— ما انزل اللہ ——— (قرآن مجید) کی رو سے فیصلے نہیں کرتے انہیں مومن نہیں کہا جا سکتا۔ (۵/۴۴)

ہمارے سانحہ ہوا یہ ہے کہ اُمت کی مرکزی اتھارٹی (حکومت خداوندی یا خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کے باقی نہ رہنے سے دین، مذہب میں تبدیل ہو چکا ہے، اس لئے اس میں مختلف فرقے پیدا ہو چکے ہیں۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ان فرقوں کو باقی رکھتے ہوئے اسلامی نظام (یعنی دینِ خداوندی) قائم ہو سکتا ہے تو وہ یا تو دین اور مذہب میں فرق کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور یا پھر اُمت کو فریب میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ فرقوں کی موجودگی میں دین کا نظام قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ دین کا نظام قائم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ یہ کہ ایک ایسی مملکت کا قیام عمل میں آئے جو قرآنی اصولوں کو مملکت کا آئین قرار دے۔ اُمت کے مشورہ سے ان اصولوں پر

عمل پیرا ہونے کے طور طریق وضع کرے۔ انہیں قوانینِ حکومت کی حیثیت سے تمام مسلمانوں پر یکساں نافذ کرے ۔ اس میں نہ اس فرقے یا اُس فرقے کی کوئی تمیز ہو اور نہ ہی پرسنل اور پبلک لاز کی تفریق ۔ اس طرح ایک خدا ۔ ایک ضابطۂ قوانین اور ایک امت کی تشکیل سے، دین کا نظام قائم ہو گا۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو احیاءِ اسلام کی ہر کوشش رائیگاں جائے گی۔

یہ تھی خلافتِ راشدہ کے بعد اسلامی مملکت کے قیام کی وہ ممکن العمل شکل جسے علامہ اقبالؒ نے پیش کیا اور جس کے مطابق ایک خطۂ زمین کے حصول کے لئے قائدِ اعظمؒ، تحریکِ پاکستان کو وجود میں لائے۔ وہ علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ بنیادی اصول کو کس طرح واضح طور پر سمجھ چکے تھے، اس کی تفاصیل طلوعِ اسلام میں متعدد بار پیش کی جا چکی ہیں۔ انہوں نے ان تمام تفاصیل کو ان چند فقروں میں جامع طور پر سمیٹ کر رکھ دیا تھا کہ

اسلامی حکومت کے تصوّر کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیش کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصولاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی کا نام ہے۔

یہ وہ حدود ہیں جو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہتے ہیں، اور ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، ملتِ اسلامیہ اپنی مملکت کے لئے قوانین و ضوابط وضع کرتی ہے جن کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی مملکت وجود میں نہیں آسکتی، اور اگر وجود میں آجائے تو مستحکم نہیں رہ سکتی، جب تک اس میں ایک (واحد) ضابطۂ قوانین نافذ نہ ہو۔ جس مملکت میں مختلف گروہ اپنے لئے الگ الگ قوانین و ضوابط وضع کر لیں، اس میں انارکی پھیل جاتی ہے۔ سیکولر اسٹیٹ میں قانون سازی کا مسئلہ آسان ہوتا ہے۔ اس میں مختلف مذہبی گروہوں کو ان کے اپنے شخصی قوانین پر عمل پیرا ہونے کی آزادی دے دی جاتی ہے اور پبلک لاز کا ضابطہ، بلا تمیزِ مذاہب، آزادانہ وضع کر لیا جاتا ہے جس کا اطلاق تمام باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔ لیکن اسلام میں نہ تو پرسنل لاز اور پبلک لاز میں تفریق ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے پبلک لاز بلا حدود و قیود جس طرح جی چاہے وضع کئے جا سکتے ہیں۔ یہ سب قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے وضع کئے جاتے ہیں۔

☆

اب ہم ان تین نکات کی طرف آتے ہیں جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے ۔ یعنی (۱) اسلام کیا ہے اور مسلمان کسے کہتے ہیں (۲) اسلامی قوانین کیسے مرتب ہو سکتے ہیں اور (۳) اسلامی حکومت کی تشکیل۔ پہلا نکتہ بنیادی ہے اور اسی محور کے گرد ہماری ساری زندگی گردش کرتی ہے۔ قرآن کریم نے اسے چار لفظوں میں متعین طور پر واضح کر دیا ہے جب کہا ہے :-

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)۔

جو لوگ امورِ زندگی کے فیصلے قرآن مجید کے مطابق نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔

بات بالکل صاف ہے۔ زندگی کے معاملات کے متعلق قرآن مجید کو سند، حجت اور حرفِ آخر تسلیم کرنا اسلام ہے۔ یوں تو قرآن مجید کی متعدد خصوصیات اللہ تعالےٰ نے بیان کی ہیں لیکن ان میں دو تین خصوصیات بنیادی ہیں یعنی

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۵)۔

خدا نے جو کچھ دین کے متعلق کہنا تھا اسے اس کتاب میں مکمل کر دیا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

قرآن کی اکملیت اور ابدیت اور اس کے ساتھ اس کی محفوظیت (۱۵/۹)۔ اکملیت کے معنے یہ ہیں کہ دین سارے کا سارا اس کے اندر ہے۔ اس سے یہ مکمل ضابطہ حیات قرار پاتا ہے۔ اور غیر متبدل کے معنے یہ ہیں کہ دین کے متعلق جو کچھ اس میں کہا گیا ہے اسے کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اور محفوظیت کے معنے یہ ہیں کہ یہ قیامت تک غیر محرف اور موجود رہے گا۔ قرآن مجید کی ان ہر سہ خصوصیات کا فطری نتیجہ ختم نبوت ہے۔ اقبالؒ کا کلام قرآن مجید کی ان خصوصیات کا پیام بر ہے۔ اس کا ملخص ان کے اس ایک شعر میں آ گیا ہے کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

قرآنی حدود اور قیود کی پابندی سے انسان مسلمان قرار پاتا ہے اور ان حدود و قیود میں نہ تغیر و تبدل ہو سکتا ہے نہ حک و اضافہ۔ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ سب بجا اور درست، لیکن قرآنی احکام و قوانین کی تعبیر میں تو اختلاف ہو سکتا ہے۔ اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ اس باب میں پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں (۴/۸۲) دوسرے یہ کہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ اور تیسرے یہ کہ اختلافی معاملات کا فیصلہ اسلامی مملکت کی مرکزی حکومت کرے گی۔ یہ خود قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

دوسرا سوال اسلامی مملکت میں قانون سازی سے متعلق ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ اس نے (بجز چند احکام) اصول اور حدود متعین کر دیئے ہیں اور جزئی و تفصیلی قوانین خود وضع نہیں کئے۔ اسے اسلامی مملکت پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ ان حدود کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے تفصیلی قوانین خود وضع کرے۔ یہ حدود اور اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کے اندر وضع کردہ قوانین میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کی جا سکے گی۔ ہمارے ہاں جن قوانین کو اسلامی یا شرعی کہا جاتا ہے وہ درحقیقت کسی زمانے میں اُس وقت کی ضروریات کے مطابق وضع کردہ قوانین تھے۔ انہیں دین قرار دینا اور غیر متبدل سمجھنا، انہیں درحقیقت قرآن کا درجہ دے دینا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات تشکیل جدید میں اس موضوع پر بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ بہتر ہو کہ اسے آپ ان ہی کے الفاظ میں ملاحظہ کریں۔ وہ کہتے ہیں:۔

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دُنیا میں جہاں تغیر کا دَور دَورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے

متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں ـــــ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ـــــ تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا، دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کون سا اصولی حرکت کارفرما ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔

اس اصول کی روشنی میں علامہ اقبالؒ نے فقہی قوانین کے متعلق بڑی تفصیلی بحث کی ہے اور کہا ہے کہ یہ قوانین اُس زمانے کی ضروریات پوری کرنے کے لئے تھے جب یہ مرتب کئے گئے تھے۔ خود آئمۂ فقہ کا بھی یہ منشاء نہیں تھا کہ یہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں:-

اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں فقہ کے اصول اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقاء ہے اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرتے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہنمائی لے سکتے ہیں۔ لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے .... اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا اسلام کے خلاف افتراء ہے۔

قانون سازی کا یہ تصور پیش کرتے ہوئے انہیں اس کا احساس تھا کہ قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوگی کیونکہ وہ مروّجہ قوانینِ شریعت میں کسی قسم کی تبدیلی جائز نہیں سمجھتے۔ اسی لئے انہوں نے اس بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا کہ

وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے یہ ہے کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی جد و جہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہونا چاہیئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ

حسبنا کتاب اللہ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے

اس موضوع پر علامہ اقبالؒ نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے لیکن ہم سردست اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت علامہ کے نزدیک ہر زمانے کی اسلامی مملکت کو اس کا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ قرآن کریم کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے قوانین خود وضع کرے۔ ان ہی

قوانین کو اُس زمانے کے لئے قوانینِ شریعت کہا جائے گا۔

اب رہا تشکیلِ حکومت کا سوال، سو علامہ اقبالؒ کے ثبات و تغیر کے اصول کی رُو سے اس سوال کا جواب بھی کچھ مشکل نہیں۔ صدرِ اوّل میں جو اسلامی حکومت قائم ہوئی تھی، وہ قرآنی اصولوں کی روشنی میں اُس زمانے کے حالات کے مطابق تھی۔ ہمارے زمانے کے حالات اس سے مختلف ہیں۔ لہٰذا، ہم قرآن کے اصولوں کی روشنی میں حکومت کا طریق کار خود متعین کر سکتے ہیں۔ اصل سوال قرآن مجید کی اقدار، اصول اور حدود کا ہے، طریق کار اور اس کی جزئیات کا نہیں۔ اسلامی حکومت کا اصل الاصول وہی ہے جسے قرآن نے کفر اور اسلام میں حدِ امتیاز قرار دیا ہے: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)۔ یعنی اسلامی حکومت اس کی پابند ہوتی ہے کہ وہ ہر معاملہ کا فیصلہ قرآن مجید کے مطابق کرے۔ جہاں تک فیصلہ کرنے کے طریق کار کا تعلق ہے اس نے اس کے لئے بھی ایک اصول دیا ہے اور وہ یہ کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸)۔ یعنی اس کے فیصلے اُمت کی مشاورت سے ہوں گے۔ اس مشاورت کا طریق کار کیا ہوگا اسے قرآن کریم نے خود متعین نہیں کیا۔ اسے ہر زمانے کی اسلامی حکومت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ مغربی جمہوریت اس لئے غیر اسلامی ہے کہ اس میں فیصلے کرنے کے اختیارات پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاتی۔ اسلامی نظام میں فیصلے کرنے کے اختیارات بلا قیود نہیں ہوتے۔ وہ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے ہی استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ یہی پابندی اس نظامِ مشاورت کو اسلامی بناتی ہے۔

یہ ہے فکرِ اقبالؒ کی روشنی میں ان (بظاہر) مشکل نظر آنے والے سوالات کا حل۔ اگر اس کے مطابق عمل شروع ہو جائے تو اس ملک کی تقدیر بدل جائے۔

قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کیلئے عطیات کے چیک یا بنک ڈرافٹ

ایم۔ ایم خلیل کے نام

حبیب بینک مین مارکیٹ گلبرگ لاہور

پر کاٹے جائیں۔ اور خلیل صاحب کے نام۔ ۲۵ پی گلبرگ ۲ لاہور کے پتہ پر بھیجے جائیں۔
اسی طرح منی آرڈر بھی۔ عطیات بھیجنے میں جلدی کیجئے تاکہ پروگرام میں پیش رفت ہو۔
جیسا کہ سابقہ اشاعت میں بتایا جا چکا ہے یہ عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔

شکریہ

اِنتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں

۱۔ مطالب الفرقان (جلد سوم) مطالب الفرقان کی پہلی جلد اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی اور دوسری جلد اکتوبر ۱۹۷۶ء میں۔ ارادہ تھا کہ آئندہ جلدیں اسی رفتار سے شائع کی جاتی رہیں گی۔ چنانچہ جلد سوم کا مسودہ ۱۹۷۷ء میں مکمل ہو گیا تھا لیکن کتابت اور طباعت کے راستے میں ایسی رکاوٹیں پیش آتی رہیں جن کی وجہ سے اس کی اشاعت میں صبر آزما حد تک تاخیر ہوتی چلی گئی۔ للہ الحمد کہ اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں اور کتاب چھپ کر آ گئی ہے۔ یہ سورۂ بقرہ کی آیات ۱۱۳ تا ۲۸۶ (اختتام سورۂ بقرہ) پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں اس کے ساتھ چھتیس صفحات پر پھیلا ہوا تینوں جلدوں (یعنی سورۂ فاتحہ اور مکمل سورۂ بقرہ) کے مضامین کا انڈکس بھی شامل ہے۔ اس سے قرآنِ کریم کی نمایاں تعلیم بیک نظر سامنے آ جاتی ہے۔ کتابت۔ طباعت۔ کاغذ۔ جلد میں سابقہ معیار برقرار رکھا گیا ہے لیکن ضخامت اس کی پہلی دونوں جلدوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ یعنی قریب ساڑھے پانچ سو صفحات۔ اس لحاظ سے قیمت میں بھی کچھ اضافہ ناگزیر ہو گیا۔ یعنی -/۷۵ روپے فی جلد (علاوہ محصول ڈاک)۔

۲۔ قرآنی فیصلے (جلد چہارم) کتاب "قرآنی فیصلے" کی اس وقت تک تین جلدیں شائع ہوئی تھیں۔ پہلی جلد کچھ عرصہ سے ختم ہو گئی تھی۔ اب بحمدہٖ تعالیٰ وہ بھی دوبارہ چھپ گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ پہلی دفعہ چوتھی جلد بھی جس میں بڑے اہم موضوعات آ گئے ہیں۔ چونکہ اس کی ضخامت بھی بڑھ گئی ہے اس لئے اس کی قیمت فی جلد -/۱۵ روپے ہے۔ پورے سیٹ (چاروں جلدوں) کی قیمت -/۴۵ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

۳۔ طاہرہ کے نام خطوط اس نہایت اہم کتاب کا سابقہ ایڈیشن کچھ مدت ہوئی ختم ہو گیا تھا۔ اب اس کا نیا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔ قیمت -/۱۰ روپے فی جلد

۴۔ اسلامی معاشرت اسی طرح اسلامی معاشرت جیسی مقبولِ عام کتاب کا سابقہ ایڈیشن بھی ایک عرصہ ہوا ختم ہو گیا تھا۔ اب کتاب دوبارہ چھپ گئی ہے۔ قیمت -/۶ روپے فی جلد

تمام کتابوں کی قیمت بلا محصول ڈاک ہے۔ مطالب الفرقان جلد سوم۔ اور قرآنی فیصلے جلد چہارم چونکہ پہلی بار شائع ہوئی ہیں اس لئے تمام پیشگی خریداروں کو بلا طلب بھیجی جائیں گی۔ باقی کتابیں طلب کرنے پر۔

۵۔ تصوّف کی حقیقت تصوّف کی تاریخ اور حقیقت سے متعلق پرویز صاحب کی مدت العمر کی جگر کاویوں کا نتیجہ کتابت کا مرحلہ طے کر رہا ہے۔ حصہ اوّل تصوّف اور اسلام سے متعلق ہے اور حصہ دوم تصوّف اور اقبال سے متعلق۔ یہ اس موضوع پر عجیب و غریب تصنیف ہو گی بالخصوص اس لئے کہ پرویز صاحب کی عمر کا ایک حصہ خود اس دشت کی سیاحی میں گزرا ہے۔ ہم کوشش کریں گے اس کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر نہ ہو۔ لیکن غیر متوقع رکاوٹوں کی بات کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ وانتظروا۔ انی معکم من المنتظرین۔ (ناظم ادارہ)

قاضی دین الحق (کراچی)
(بیاد مولانا غلام مرشد علیہ الرحمۃ)

اُن کی باتیں یاد رہیں گی

موتُ العالِم موتُ العالَم ایک حقیقت ہے۔ برِصغیر پاک و ہند کی دینی اور علمی تحریک میں مولانا غلام مرشد (مرحوم) کا نام ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ وہ میرے مہربان مشفق مگر سخت گیر استاد تھے۔ مجھے جو کچھ آتا ہے صرف انہی کی نگاہِ فیض کا اثر ہے۔ میں نے قرآنِ کریم لفظاً لفظاً اُن کے رفیقِ کار قاضی سراج احمد صاحب سے پڑھا جو اٹھیرہ میں قیام کرتے تھے۔ عربی کے شعر اور زمانہ جاہلیت کے شعراء کے کلام سے باخبر تھے۔ قرآنِ کریم کے اہم مقامات اور تفسیر مولانا غلام مرشد (خدا اُن کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اُن کے درجے بلند کرے) سے پڑھی۔ وہ قرآنِ پاک کی تفسیر قرآنِ پاک کی رُو سے کرنے کے پابند تھے۔ اور اس سلسلہ میں شمالی ہند میں (سوائے قبلہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری (مرحوم) استاد جامعہ ملیہ دہلی) کوئی اُن کا شریک و سہیم نہ تھا۔ میں اس وقت اشاعتِ اسلام کالج انجمن حمایتِ اسلام لاہور کا طالب علم تھا۔ وہ کالج کے واجب الاحترام استاد اور وائس پرنسپل تھے۔ (۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۴ء)

وہ درسِ نظامیہ کے فارغ التحصیل تھے۔ حافظِ قرآن تھے۔ وسیع مطالعہ کے مالک تھے۔ انہوں نے کچھ عرصہ مدرسہ نعمانیہ لاہور میں بھی بطور مدرس کام کیا۔ پھر وہ بھاٹی گیٹ کے اندر اونچی مسجد میں بعد نمازِ مغرب اور شہری مسجدیں بعد نمازِ فجر قرآنِ کریم کا درس دینے لگے۔ درسِ قرآن کے سلسلہ میں گوناگوں تکالیف و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ مالی پریشانی اس پر مستزاد تھی۔ مگر وہ باعزم اور باہمت تھے۔ اس لئے درس دیتے رہے۔ یہ مخالفت کیوں تھی۔ مخالف کون تھے؟ ایک دردناک، افسوسناک پہلو ہے۔ اور ہماری ملی جہالت کا آئینہ دار اور خود غرضی کا ایک المیہ شاہکار۔ اس وقت مساجد میں بالخصوص لاؤڈ سپیکر کا رواج کم تھا۔ قبلہ مولانا مرحوم قدآور آوازِ گرج والی، ضروری خطبہ مسنونہ کے بعد آہستہ آہستہ کلام شروع کرتے۔ چند منٹ کے بعد اُن کی گرجدار آواز دور دور تک سنائی دیتی تھی۔ مجمع دم بخود چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا۔ اُن کی تقریر مدلل۔ مسکت۔ حقائق پر مبنی ہوتی تھی۔ لوگ تھکاوٹ محسوس نہ کرتے تھے۔ سامعین میں طالب علم، وکلاء، مسلم آفیسرز، پروفیسر صاحبان، تاجر، صنعت کار، عام دکاندار بھی شامل ہوتے تھے۔ اُونچی مسجد (بھاٹی گیٹ) شہری مسجد (ٹبی بازار) اور اشاعتِ اسلام کالج تک اُن کی علمی سرگرمیاں جاری اور محدود تھیں۔ وہ عام جلسہ جلوس میں شاذ و نادر جاتے تھے۔ ایک دفعہ مکلیگن کالج انجینئرنگ "مغلپورہ" کے پرنسپل کے خلاف ایک جلسہ ہوا۔ شاہ عطاء اللہ شاہ بخاری (مرحوم) جلسہ کے خطیب تھے۔ وہ تمام حاضرین جلسہ کو پیچھے لگا کر کالج کی پکٹنگ پر لے گئے۔ مولانا بھی شامل حاضرین تھے۔ پولیس کی لاٹھی چارج سے گزر کر جیل کی کوٹھڑی تک

نوبت پہنچی - انہوں نے اندرِ سیاسی لیڈروں کی جو قلابازیاں دیکھیں ان سے اس قدر دل افسردہ ہوئے کہ پھر کسی ہنگامہ آرائی میں حصہ نہ لیا۔ یہ واقعہ ۱۹۳۳ء سے پہلے کا ہے - اور اُن کی زبانی -

انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ پہ اُن کی تقریر کے لئے خصوصی انتظام ہوتا تھا۔ پروفیسر علم الدین سالک، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، مولانا ظفر علیخاں (زمیندار) سید حبیب (سیاست) خود شاعرِ مشرق فیلسوفِ اسلام ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال (جو اب سب مرحوم ہو چکے ہیں) مولانا محترم کے بیحد مداح، شائق اور چاہنے والے تھے۔ مجھے ذاتی طور پہ معلوم ہے کہ ڈاکٹر مرحوم کے پاس عربی میں لکھے ہوئے کاغذات کسی خاص موضوع پر موصول ہوئے۔ وہ کسی سے پڑھے نہ جاتے تھے۔ بالآخر مولانا محترم کو تکلیف دی گئی۔ انہوں نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کا انہوں نے سنہری مسجد کے درس میں بھی ضمناً ذکر کیا تھا۔ وہ کاغذ کالج میں بھی لاتے تھے اور ترجمہ کرتے رہتے تھے۔ وہ قرآن کی لغت۔ اس کے ماخذ، اس کے مضامین پر کامل عبور رکھتے تھے۔ محمد بخش مسلم، عبدالکریم شورش کاشمیری (چٹان) علاؤالدین صدیقی جو بعد میں لاہور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے اور علامہ صدیقی کہلائے۔ اُن کے خصوصی تلامذہ میں سے تھے۔ علمی اور دینی مسائل میں اُن سے رجوع کرتے تھے۔

اس وقت مولانا معوان حسین بادشاہی مسجد کے خطیب تھے۔ اُن کی وفات کے بعد ایک اور صاحب خطیب ہوئے (نام یاد نہیں رہا) پھر مولانا غلام مرشد صاحب کو خطیب بنایا گیا۔ ڈاکٹر اقبالؒ (مرحوم) نے اس انتخاب کو بے حد پسند فرمایا۔ اُس وقت ایک انجمن اسلامیہ تھی جس کے ممبران بڑے بڑے سر اور خان بہادر تھے۔ گورنر پنجاب کنٹرولنگ اتھارٹی تھا۔ (ان میں سے میاں امیرالدین ابھی بقیدِ حیات ہیں) مولانا نے اپنی آزادانہ مگر نقادانہ روش خطیب ہوتے ہوئے بھی قائم رکھی۔ انہی کی کوشش سے محکمہ اوقاف قائم ہوا۔ مگر اس محکمہ نے سب سے پہلے انہی کو خطیب کے عہدہ سے الگ کیا کیونکہ وہ نواب کالا باغ (گورنر مغربی پاکستان) کو خوش نہ کر سکے۔ لاہور کے در و دیوار تقریباً ۵۰ سال یعنی نصف صدی اُن کی آواز سنتے رہے۔ وہ لاہور کے ہر دلعزیز مفسرِ قرآن کے پرشکوہ اور پروقار لفظ سے یاد کئے جاتے تھے۔ وہ اکثر و بیشتر گھر پیدل آتے جاتے تھے اور قرآن کریم کا دور کرتے رہتے تھے۔ میں نے اپنے دورانِ قیام اشاعتِ اسلام کالج (لاہور) ان کو سواری پر نہیں دیکھا۔

صوت اچھی۔ قد لمبا، تھوار کا جوتا، شلوار۔ اُس پر کوٹ سر پہ ترکی ٹوپی۔ سر کے بال اکثر و بیشتر تیل سے تر، میں نے اُن کو پہلے دن اور آخری دن اسی طرح دیکھا۔ جمعہ کے روز یا کسی خاص موقع پہ کُلاہ پہ پگڑی اپنے روایتی انداز میں پہنا کرتے تھے۔

اپنے ذاتی اور گھریلو حالات سے کسی کو آگاہ نہیں ہونے دیتے تھے ۳ سال کی شاگردی میں اتنا معلوم ہو سکا کہ ضلع سرگودھا کے رہنے والے ہیں اور بس۔

جس روز تنخواہ تقسیم ہوتی یا وظیفہ کی رقم تقسیم ہوتی (طلباء کو انجمن حمایت اسلام لاہور کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا) سب پرنسپل صاحب کے کمرہ میں جا کر دستخط کرتے تھے۔ مگر اُن کی باری پہ پرنسپل خود رجسٹر لے کر اُن کے پاس آتے اور دستخط کرواتے۔ مولانا تنخواہ، جو بطور الاؤنس ملتی تھی، خود نہ پکڑتے تھے۔ پرنسپل صاحب سے کہتے کہ شیخ عبدالمجید کو دے دو۔ (وہ ایک نو مسلم تھے اُن کے والد گلاب سنگھ تھے) وہ رقم لے کر اپنی قیام گاہ کو

جاتے ہوئے مولانا محترم کے مکان پہ دیئے جاتے تھے۔

وہ ایک حق گو، بے باک، موحد خطیب تھے۔ بڑے باخبر اور علم والے۔ اپنی بات منوانے کے لئے دلائل و براہین ہمیشہ آراستہ پیراستہ رکھتے تھے۔ اُن کے بے شمار تلامذہ اور شاگرد ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

علامہ علاؤ الدین صدیقی ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی۔ایم۔او۔ایل۔ سابق ڈسٹرکٹ پنچائت آفیسر، ضلع ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) جو اپنے مطالعہ اور زورِ خطابت کی بناء پہ لاہور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ بہت خوبیوں کے انسان تھے۔

عبدالحمید مرزا ایم۔اے۔ایم او۔ایل جو اپنی خطیبانہ صلاحیت کی وجہ سے جامع مسجد آسٹریلیا بلڈنگ بالمقابل ریلوے اسٹیشن لاہور کے خطیب ہوئے۔ وہ ادارہ اصلاح نوجوانانِ مسلم کے بانی تھے۔

مولانا عبدالستار خاں نیازی جواب ملک کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں (یہ تینوں اصحاب یکے بعد دیگرے اشاعتِ اسلام کالج لاہور سے وابستہ رہے) ان دو نوجوانوں (عبدالحمید مرزا اور عبدالستار خاں نیازی) کی بدولت پنجاب میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم ہوئی۔ اور مسلم لیگ کو سہارا ملا ورنہ سر فضل حسین اور سر سکندر حیات خاں کی یونینسٹ پارٹی کا دور دورہ تھا۔ علامہ اقبالؒ پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے مگر پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ کی کوئی آواز نہ تھی۔ صرف ملک برکت علی مرحوم نمائندگی کرتے تھے۔ انہی دو نوجوانوں کی بدولت (یہ اُس وقت جوان تھے) سٹر (بعد کے قائدِ اعظم) محمد علی جناح لاہور تشریف لائے۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس کی صدارت کی اور جامع مسجد آسٹریلیا بلڈنگ میں نمازِ جمعہ عوام کے ساتھ مرزا عبدالحمید کی امامت میں ادا کی۔ عبدالستار نیازی ساتھ تھے۔ جناح صاحب انگریزی لباس میں ملبوس تھے۔ اس وقت کے جوش و خروش کا کیا کہنا!

علامہ اقبالؒ مرحوم کی وفات پر (اپریل ۱۹۳۸ء) مولانا غلام مُرشد خود گورنر پنجاب کے پاس گئے اور ملے اور کہا کہ مرکزی حکومتِ ہند سے اجازت منگوا کر دیں کہ اسلامیانِ لاہور ڈاکٹر اقبال مرحوم کو اسلام کی عظمتِ رفتہ کے نشان کے پہلو میں دفن کرنا چاہتے ہیں۔ گورنر پنجاب نے مولانا کو اطمینان دلایا کہ حکومتِ پنجاب دوپہر تک اجازت نامہ کی اطلاع آپ کو پہنچا دے گی۔ (کیونکہ شاہی مسجد لاہور اور اس سے متعلقات، محکمہ آثارِ قدیمہ کے تحت ہیں جو ایک مرکزی محکمہ ہے)

مولانا محترم سے عوامی اختلاف کی چند تاریخی مثالیں

۱۔ راجپال مصنف رنگیلا رسول اور مقدمہ ہائی کورٹ پنجاب۔ (راجپال کو علم الدین شہید نے قتل کر دیا تھا) ماتحت عدالت نے راجپال کو جرمانہ اور قید کی سزا دی۔ ہائیکورٹ نے جرمانہ بحال رکھا۔ سزا معاف کر دی۔
(فیصلہ جسٹس دلیپ سنگھ)

عوام نے جسٹس دلیپ سنگھ کے خلاف مہم چلائی۔

مولانا کا مؤقف یہ تھا کہ جسٹس کا کوئی قصور نہیں۔ قانون کی دفعات کا قصور ہے۔ تمام پریس ایک طرف مولانا ایک

طرف ۔ (یہ ۱۹۳۷ء سے پہلے کا واقعہ ہے)

یاد رہے کہ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کا بھی یہی مؤقف تھا۔

۲۔ وہ جلسہ۔ جلوس۔ ہنگامہ آرائی کے خلاف تھے۔

۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کی تحریک اٹھی۔ مولانا نے زور دیا کہ اپنی قانونی حیثیت عدالت سے منوائی جائے اور مسجد سکھوں سے آزاد کرائی جائے۔ تحریک چلا کر "لا اینڈ آرڈر" کا مسئلہ نہ پیدا کیا جائے چنانچہ مولانا محترم کا مؤقف درست ثابت ہوا۔

ان واقعات کے تذکرہ سے مقصود یہ بتانا ہے کہ مولانا مرحوم کا مسلک یہ تھا کہ غلط قوانین کے خلاف ہنگامہ آرائی کے بجائے انہیں آئینی اور قانونی طور پر منسوخ کرا کر ان کی جگہ صحیح قوانین نافذ کرانے چاہئیں۔ رنگیلا رسول کے کیس میں انہوں نے عدالت میں روایات کی صحیح پوزیشن کے متعلق جو بحث کی تھی وہ تاریخ کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔

۳۔ عید قربان پر ہر جگہ قربانی کی جاتی ہے۔ مولانا نے قربانی کو حج کا رکن قرار دیا۔ رکن حج کے علاوہ وہ اس طرح قربانی کرنے کو روح اسلام کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس بات کا اعلان انہوں نے بادشاہی مسجد لاہور میں ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں دلائل اور براہین سے کیا۔ مخالفت کا ایک سیلاب امنڈ پڑا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مکان کو جا رہے تھے تو کسی مخالف نے اوپر سے اینٹ اُن پر پھینکی جو سر میں چار انچ زخم کرتی ہوئی زمین پر گری۔ کئی ہفتہ ہسپتال میں رہے۔

۴۔ کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے درس نظامیہ پڑھنا ضروری ہے

مولانا یہ دلائل، یہ مؤقف رکھتے تھے کہ قرآن مجید ایک واضح اور روشن کتاب ہے جو اپنی تشریح آپ کرتی ہے اور درس نظامیہ کی محتاج نہیں۔ چنانچہ انہوں نے اشاعت اسلام کالج لاہور میں اس کو عملاً پڑھا کر سمجھا کر دکھلا دیا۔

مولانا محترم ۱۴، ۱۵ ستمبر ۱۹۷۹ء کو فوت ہوئے۔ ۸۴ سال کی عمر پائی اور اپنے آبائی گاؤں انگہ (سرگودھا) میں محو استراحت ہیں۔

ہماری قوم مردہ پرست ہے۔ زندہ انسانوں کی قدر نہیں کرتی۔ مگر ہمارے ریڈیو اور ٹی۔ وی نے مردہ پرستی میں بھی کوئی سرگرمی نہ دکھائی۔ صرف ایک مختصر سا تذکرہ ٹی وی پہ آیا۔ وہ بھی چند دن بعد۔

آنے والا زمانہ مولانا غلام مرشد کو بیسویں صدی کا علامہ ابن تیمیہؒ قرار دے گا۔ قرآن کے پیغام و افکار کے عام کرنے میں مولانا محترم نے علامہ ابن تیمیہؒ کا سا شاندار کردار پیش کیا۔ مولانا غلام مرشد فوت ہو گئے۔ ان کے علمی کارنامے کا ملخص یہ ہے کہ انہوں نے ثابت کیا کہ قرآن عمل کی کتاب ہے۔ محض ثواب کے لئے پڑھنے کی کتاب نہیں۔ یہ زندگی کا دستور ہے۔ یہ اوامر و نواہی کا سرچشمہ ہے۔ جھاڑ پھونک کا مجموعہ نہیں۔ یہ آئین جہانگیری ہے۔ ضابطۂ جہانبانی ہے۔ قانون حکمرانی ہے۔ اس کا قانون عدل ایک ایسا متوازن معاشرہ پیدا کرتا ہے جس سے دنیا جنت بن جاتی ہے۔ اس کا قانون اخوت اور قانون مساوات معاشرہ کی طبقاتی کشمکش اور اقتصادی بدحالیوں کو مٹانے اور امن و سکون پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

یہ تھے مولانا محترم غلام مرشد صاحب جنہوں نے قرآنی افکار و پیغام کے پھیلانے میں نصف صدی ——— یعنی ۵۰ سال اپنی عمر کے صرف کئے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

ان کے اسی منفرد اور مخصوص قرآنی فہم و تفہیم کا نتیجہ تھا کہ وہ کسی سے جلد گھلتے ملتے نہیں تھے دوسری طرف اس کا یہ بھی نتیجہ تھا کہ وہ بہت جلد میرے بزرگ اور نیک دوست چوہدری غلام احمد صاحب پرویز سے واقف شناسا ہو گئے جو اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں قرآن کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں اور معارف القرآن۔ لغات القرآن۔ مطالب الفرقان۔ تبویب القرآن جیسی تصانیف کو عام کر کے اسلام کی عظمت رفتہ کے احیاء کی پیہم سعی کر رہے ہیں۔

بیادِ علامہ اسلم جیراجپوری (علیہ الرحمۃ)

(علامہ) محمد اسلم؛ اپنے وطن جیراجپور (ضلع اعظم گڑھ) میں سنہ ۱۲۹۹ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد (مولانا سلامت اللہ مرحوم) بھوپال میں محکمہ تعلیمات کے مہتمم تھے۔ بھوپال، اس زمانے میں، نواب صدیق حسن خاں (مرحوم) کی وجہ سے اہلِ حدیث کا مرجع اور مرکز تھا۔ وہاں دنیا بھر کے علماء اہلِ حدیث کا مجمع رہتا تھا۔ (علامہ) اسلم کی ابتدائی تعلیم اور تربیت اس ماحول میں ہوئی۔ اور اسے مبداءِ فیض کی کرم گستری کے سوا اور کیا کہا جائے کہ یہی اسلم جیراجپوری بعد میں "حسبنا کتاب اللہ" کا انقلابی مسلک اختیار کرنے والوں میں سرِفہرست تھے۔ انہوں نے باقی عمر قرآنِ مجید کی تبلیغ و تدریس میں صرف کی۔

یہ ان کی زندگی کا پہلا انقلاب تھا۔ دوسرا انقلاب بھی اسی انداز کا حیرت افزا تھا۔ وہ ابتدا ہی سے آزادی کی تڑپ اپنے دل میں رکھتے تھے۔ (غیر منقسم) ہندوستان میں جب انگریز کی حکومت کے خلاف ترکِ موالات کی تحریک اٹھی تو وہ علی گڑھ یونیورسٹی سے وابستہ تھے۔ (مولانا) محمد علی جوہر (مرحوم) کی ترغیب پر وہاں کے طلباء اور اساتذہ نے ترکِ موالات کی آواز پر لبیک کہا اور اپنا ایک آزاد تعلیمی ادارہ قائم کر لیا۔ (علامہ) اسلم بھی اس گروہ میں شامل تھے۔ پہلے یہ ادارہ علی گڑھ میں رہا اور اس کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے دہلی (قرول باغ) میں منتقل ہو گیا۔ علامہ (مرحوم) اپنے عہد کے ایفا میں، ساری عمر اس ادارے سے منسلک رہے۔ یہ ادارہ خالصۃً "نیشنلسٹ" (کانگریسی) تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین (مرحوم) جو تقسیم ہند کے بعد بھارت کے صدر منتخب ہوئے تھے، اس کے پرنسپل (شیخ الجامعہ) تھے۔ اور آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہو گی کہ کانگریسیوں کے اس ہجوم میں علامہ مرحوم تحریکِ پاکستان کے نہایت جری اور بیباک حامی تھے کیونکہ اس تحریک کا منتہیٰ ایک ایسی مملکت کا حصول تھا جس میں قرآنی نظام قائم کیا جائے گا۔ جب سنہ ۱۹۳۸ء میں طلوعِ اسلام کا اجراءُ ہوا تو اس میں ان کے گرانقدر مقالات اکثر و بیشتر شائع ہوتے تھے۔ ان میں بالواسطہ اور بلاواسطہ اسلامی نظامِ مملکت کی توضیح و تشریح ہوتی تھی۔ تقسیم ہند پر وہ پاکستان تشریف لائے اور پرویز صاحب کے ہاں فروکش ہوئے لیکن چونکہ یہاں اہلِ علم حضرات کے لئے گنجائش نہیں تھی اس لئے وہ واپس تشریف لے گئے۔ بایں ہمہ طلوعِ اسلام کے ساتھ ان کا قلبی رشتہ بدستور قائم رہا۔ پرویز صاحب کو تو وہ بمنزلہ اپنی اولاد کے سمجھتے تھے اور ان کے ہاں ان کی حیثیت بزرگِ خاندان کی سی تھی۔

(۲۸) دسمبر سنہ ۱۹۵۵ء کی صبح، جب وہ لیٹے ہوئے طلوعِ اسلام کا مطالعہ فرما رہے تھے، حرکتِ قلب بند ہونے سے ان کا اچانک انتقال ہو گیا اور اس طرح قرآنی روشنی کا یہ بلند مینار ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ طوبیٰ لہ و حسنِ مآب۔ ان کے یومِ وفات کی نسبت سے، اشاعتِ رواں میں ہم انکے دو مقالات ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ پہلا مقالہ جو اسلامی نظام سے متعلق ہے سنہ ۱۹۳۸ء کا تحریر شدہ۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ اسلامی مملکت کے نظام کے متعلق ان کی نگاہ کس قدر صاف اور خیالات کیسے روشن تھے۔ دوسرا مقالہ، احکامِ وراثت کے متعلق ہے جس کا تعارف اس کے تمہیدی نوٹ میں کرا دیا گیا ہے۔

——— (٠) ———

علّامہ اسلم جیراجپوری (رحمتہ اللہ علیہ)

اسلامی نظام

(شائع شدہ طلوعِ اسلام بابت اکتوبر ۱۹۳۸ء)

قرآنِ کریم نے ملّتِ اسلامیہ کا نظام وحدتِ اطاعت پر رکھا ہے۔ یعنی اس کو سوائے اللہ کے کسی دوسرے کا مطیع نہیں بنایا۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ (۱۲/۴۰)

کسی کا فرمان نہیں سوائے اللہ کے اُس نے حکم دیا ہے کہ تم سوائے اس کے کسی کے بندے نہ بنو، یہی ہے سیدھا دین۔ مگر اکثر آدمی نہیں جانتے۔

وہی بلا شرکتِ غیرے اصل حاکم اور مطاع ہے۔

وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ۔ (۱۸/۲۶)

اور اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں بناتا۔

اس نے بندوں کی انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی ہدایت اور ان کی عقلوں کو صحیح راستہ پر لگانے اور اپنی رضامندی اور نارضامندی کے اعمال کو واضح کرنے کے لئے ایک ناقابلِ تغیّر و تبدّل کتاب اور مکمل دستورالعمل قرآنِ کریم کو اتار دیا تاکہ اُس کے مطابق عمل کر کے لوگ اس کی خالص بندگی کی سعادت حاصل کریں اور دنیا جہان کی غلامی سے آزاد ہو جائیں۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۶/۱۵۵)

اور یہ کتاب جس کو ہم نے اتارا ہے مبارک ہے اس کی پیروی کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو۔ امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔

اللہ کی اطاعت کے معنی یہی ہیں کہ اس کی کتاب کی پیروی کی جائے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (۶/۱۱۵)

کیا اللہ کے سوا میں کسی اور کو حاکم بناؤں، حالانکہ اللہ تو وہ ہے جس نے تمہاری طرف مفصّل کتاب اتاری ہے۔

اس کتاب کے سوا کسی دوسرے کی پیروی ممنوع ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۷/۳)

اسی کی پیروی کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے اور اس کے سوا دوسرے آقاؤں کی پیروی نہ کرو!

چنانچہ جن لوگوں نے دنیا میں اپنے سرداروں اور بزرگوں کی اطاعت نجات کا ذریعہ سمجھ کر کی ہے وہ قیامت میں جب نتیجہ برعکس دیکھیں گے تو جل کر کہیں گے۔

رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا۠ - رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا - (۳۳/۶۷-۶۸)

رسالت

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں۔

(۱) پیغمبری۔ یعنی پیغامِ الٰہی کو لوگوں ـــــ کے پاس بے کم و کاست پہنچا دینا۔ اس حیثیت سے آپ کی تصدیق کرنا اور آپ کے اوپر ایمان لانا فرض کیا گیا۔

(۲) امامت، یعنی اُمّت کا انتظام، اس کی شیرازہ بندی، اُن کے باہمی قضایا کے فیصلے، تدبیر، مہمّات، جنگ و صلح وغیرہ اجتماعی امور میں اُن کی قیادت اور قائم مقامی وغیرہ۔ اس حیثیت سے آپ کی اطاعت و فرمانبرداری لازم کی گئی۔

پہلی حیثیت یعنی پیغمبری کے لحاظ سے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو کسی سے مشورہ لینے کا حکم نہ تھا بلکہ فریضۂ تبلیغ اللہ کی طرف سے آپ کے ذمہ لازم کر دیا گیا تھا۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (۵/۶۷)

اے رسول! جو تجھ پر اتارا گیا ہے اس کو پہنچا دے اور اگر تو نے نہ کیا تو اللہ کے پیغام کی تبلیغ نہیں کی!

لیکن بحیثیتِ امام لوگوں سے مشورہ لینے کے لئے مامور تھے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ - (۳/۱۵۹)

اور امور (حکومت) میں اُن سے مشورہ لیا کرو۔

یہ امامتِ کبریٰ جو آپ کی ذات سے بنی نوعِ انسان کی ہدایت و رہنمائی و صلاح و فلاح کے لئے قائم ہوئی قیامت تک مستمر ہے جو آپ کے زندہ نشینوں کے ذریعہ ہمیشہ رہنی چاہیئے۔ قرآن میں جو احکام رسول کی اطاعت کے لئے ہیں وہ آپ کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ منصبِ امامت کے لئے ہیں جس میں آپ کے خلفاء بھی داخل ہیں۔

یہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۴/۸۰) اور جو رسول کی اطاعت کریگا اُس نے اللہ کی

اطاعت کی۔

خلفائے رسول کی اطاعت بھی اللہ اور رسول دونوں کی اطاعت ہے۔ چنانچہ مرکز کے لئے یہی لفظ قرآن نے استعمال کیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ (۸/۲۰)

اے مومنو! اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی اور اس سے منہ نہ موڑو جس حال میں کہ تم سن رہے ہو۔

اس آیت میں عَنْهُ کی ضمیر مفرد ہے جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ "اللہ و رسول" دونوں سے ایک ہی شے مراد ہے۔ یعنی مرکز، ورنہ قاعدہ کے مطابق یہاں "عنهما" ہونا چاہیئے تھا۔ اور "جس حال میں کہ تم سن رہے ہو" کی قید سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ اطاعت بالمشافہہ ہے اور عربی میں اطاعت کے معنی ہی ہیں زندہ کی فرمانبرداری۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ۔ (۸/۲۴)

اے مومنو! اللہ و رسول کی بات مانو جب وہ تم کو ایسے کام کے لئے بلائے جس میں تمہاری زندگی ہو۔

یہاں بھی دَعَا کا صیغہ مفرد ہی اللہ اور رسول دونوں کے لئے مستعمل ہوا ہے۔ اور یہ حکم بھی صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ ہمیشہ کے لئے ہے جو آپ کے تمام آنے والے خلفاء پر مشتمل ہے۔

جنگِ اُحد میں ہزیمت اُٹھانے کے بعد دوسرے دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ غنیم کے تعاقب میں نکلیں۔ یہ حکم چونکہ بحیثیت امام کے تھا اس لئے قرآن میں "اللہ و رسول" دونوں کا حکم کہا گیا۔

الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ (۳/۱۷۱)

جنہوں نے حکم مانا اللہ و رسول کا اپنے زخم اٹھانے کے بعد۔

اسی طرح حجِ اکبر کے دن مشرکوں سے برأت کا اعلان جو مرکزِ اسلام کی طرف سے ہوا وہ "اللہ و رسول" دونوں کے نام سے ہوا۔

وَأَذَانٌ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ۔ (۹/۳)

اور اعلان ہے اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے لوگوں کی طرف حجِ اکبر کے دن کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بری ہے۔

باغیوں اور ڈاکوؤں کو جو مرکز کے مجرم ہیں، "اللہ و رسول" دونوں کا محارب قرار دیا گیا۔

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا ..... (۵/۳۳)

جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول سے لڑتے اور روئے زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اُن کی سزا بس یہی ہے کہ مار ڈالے جائیں ..... الخ

ان مجرموں کی یہی سزا ہمیشہ کے لئے ہے کچھ عہدِ رسالت ہی تک محدود نہ تھی۔

الغرض بیسیوں آیات ہیں جن میں "اللہ و رسول" کا لفظ مرکز کے معنی میں مستعمل ہوا ہے جس سے واضح

ہو جاتا ہے کہ اجتماعی لحاظ سے مرکز کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔

دستور العمل جس طرح اُمّتِ اسلامیہ کی انفرادی زندگی کی اصلاح کے لئے قرآن اتارا گیا ہے اسی طرح اس کی اجتماعی زندگی کا بھی دستور العمل وہی ہے۔ وہ ایسی کامل کتاب ہے کہ ہر زمان و مکان اور ہر ماحول میں افراد کی ہدایت اور ملّت کی رہنمائی کے لئے کافی ہے، اسی لئے جہاں ہر شخص کو ہدایت کی گئی ہے کہ قرآن کی پیروی کرے وہاں مرکز کو بھی یہی حکم دیا گیا ہے کہ قرآن ہی کے مطابق لوگوں کے درمیان حکومت کرے۔

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ۔ (۴/۱۰۵)

ہم نے تیرے اوپر حق کے ساتھ کتاب اُتاری ہے کہ جو کچھ اللہ تجھ کو سمجھائے اس کے مطابق، لوگوں کے درمیان فیصلے کرو۔

قرآن کے سوا کسی دوسرے کی طرف رجوع کرنے کی ممانعت کی گئی۔

فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (۵/۴۸)

اور ان کے درمیان اسی کے مطابق فیصلے کر جو اللہ نے اتارا ہے اور اس حق کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ چل۔

شدید تاکید کی گئی کہ مرکز کو قرآنی تعلیمات سے ذرا بھی غفلت روا نہیں ہے اور نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ اس پر کاربند رہنا چاہیئے۔

وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَن بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ۔ (۵/۴۹)

اور یہ کہ تو فیصلے کر اُن کے درمیان اسی کے مطابق جو اللہ نے نازل فرمایا ہے اور ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ جا۔ اور احتیاط رکھ کہ اللہ کے اتارے ہوئے کسی حکم سے وہ تجھ کو ہٹا کر فتنہ میں نہ ڈال دیں! یہاں تک کہ یہ وعید بھی کی گئی۔

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (۵/۴۷)

اور جو اللہ کے اتارے ہوئے کے مطابق حکم نہ دیں وہ فاسق ہیں[1]

فریضۂ اُمّت اسلام کے معنے ہی اطاعت کے ہیں۔ اُمّتِ اسلامیہ کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ و رسول یعنی مرکز کی مطیع رہے۔

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُم مَّا حُمِّلْتُمْ وَإِن تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا۔ (۲۴/۵۴)

کہہ دے کہ اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی۔ اگر تم روگردانی کرو گے، تو

---

[1] بلکہ کافر ہیں۔ (۵/۴۴)

اس کی ذمہ داری اس کے اُوپر ہے اور تمہاری ذمہ داری تمہارے اُوپر ہے اور جو تم اُس کی اطاعت کرو گے تو سیدھے راستے پر رہو گے۔

مرکز کے وفادار رہو اور اس سے غداری اور مفوضہ فریضہ میں خیانت کاری نہ کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (۸/۲۷)

اے مومنو! اللہ اور رسول سے غداری اور جانتے ہوئے اپنی امانتوں میں خیانت نہ کرو۔

مرکز ہی کی اطاعت کامیابی کا ذریعہ ہے۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (۲۴/۵۱)

مومنوں کا قول جب وہ اللہ و رسول کی طرف بلائے جائیں کہ ان کے درمیان فیصلہ کرے بس یہی ہے کہ کہہ دیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

مرکز کے احکام سے سرتابی کرنے والے سب سے زیادہ ذلیل ہوں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ۔ (۵۸/۲۰)

جو لوگ اللہ اور رسول سے مخالفت کریں گے وہ سب سے زیادہ ذلیل لوگوں میں سے ہونگے۔

مرکز کا حکم قطعی اور آخری ہے کسی مسلمان کو نہ اس سے انکار کا حق ہے نہ اس کا کہیں مرافعہ ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ۔ (۳۳/۳۶)

کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو اپنے معاملہ میں اختیار باقی نہیں رہتا۔ جبکہ اللہ و رسول کسی امر کا فیصلہ کر دے۔

یعنی مرکز ہر دینی و دنیاوی امر میں آخری اور بالاترین اختیار ہے۔ جس کی اطاعت کے سوا مسلم کے لئے کوئی چارہ نہیں اور جس کی نافرمانی گمراہی ہے۔

اطاعت

یہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن سوائے اللہ کے کسی دوسرے کی اطاعت کا حکم نہیں دیتا۔ یہاں تک کہ والدین کا بھی جہاں جہاں ذکر کیا ہے ان کے ساتھ سلوک اور احسان ہی کی وصیت فرمائی ہے۔ اطاعت کا حکم نہیں دیا ہے۔ دینی اطاعت خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، صرف اکیلے اللہ کی ہے۔ انفرادی لحاظ سے قرآن کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور اجتماعی لحاظ سے مرکز کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے جبتک رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اُمت میں موجود تھے ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت تھی اور آپ کے بعد اس امامتِ کبریٰ پر آپ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے، جن کا فریضہ یہ ہے کہ کتابِ الٰہی کے مطابق احکام نافذ کریں اور اُمت کے منتخبہ افراد کو مشاورت کے لئے ساتھ رکھیں۔ یہ احکام قطعی اور حتمی ہوں گے جن سے سرتابی کرنے والا اللہ و رسول کا دشمن ہوگا۔

الغرض دینِ اسلام محض ایک کتابی مذہب نہیں ہے بلکہ زندگی کا ایک مکمل عملی نظام ہے جو بدقسمتی سے مدتہائے دراز سے مسلمانوں کے ہاتھوں سے کھو گیا ہے اسی باعث سے وہ غارت ہوئے ہیں کیونکہ کسی ملّت کی زندگی جب تک کہ اُس کا زندہ مرکز نہ ہو سخت دشوار ہے۔

اجتماعی نظام کی پوری شکل اس آیت میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ ۔ (۴/۵۹)

اے مومنو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی۔ اور تم میں سے جو اُمراء ہوں اُن کی اطاعت کرو۔ اگر کسی بات میں تم تنازع کر بیٹھو تو اس کو اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ۔

یعنی اصل مطاع اللہ ہے۔ اس کی اجتماعی اطاعت ہوگی، رسول یعنی مرکز یا مرکز کے مقرر کئے ہوئے اور اختیار دیئے ہوئے مسلم امراء کے ذریعہ سے۔ اُن امراء کا کوئی فیصلہ یا حکم اگر مسلمانوں کو قرآن کے خلاف معلوم ہو تو اُس میں اُن کو امراء کے ساتھ منازعت کا حق حاصل ہے۔ اس قسم کے نزاعی امور میں مرکز کی طرف رجوع کرنا ہوگا، جو اُن کا فوراً قطعی فیصلہ کر دے گا۔

اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ملّت کا سارا نظام اجتماعی مرکز کے ہاتھ میں ہے اُسی کی طرف سے ہر شعبہ کے امراء کا تقرر ہوگا، مثلاً اُمراءِ ملک، اُمراءِ فوج، اُمراءِ عدل، اُمراءِ حج، و ائمہ صلوٰۃ و تعلیم و ارشاد وغیرہ نیز اس کا یہ بھی فریضہ ہوگا کہ افرادِ ملّت اور امراءِ ملّت کے تنازعات کو مٹاتا رہے اور ان میں باہم کسی قسم کا اختلاف و افتراق پیدا نہ ہونے دے، اس انتظامی سلسلہ سے اُمت کا کوئی فرد باہر نہیں نکل سکتا۔

اس نظام میں اربابِ علم و عقل کو فکر کی پوری حریت اور اجتہاد کی مکمل آزادی کے علاوہ قرآن نے درجاتِ عالیہ کی سربلندی بھی عطا کی ہے۔ لیکن ان کو مطاع یا متبوع نہیں قرار دیا ہے۔ اُن کی تحقیق و اجتہاد کے نتائج اُمّت کے لئے اُسی وقت صحیح ہوں گے جب مرکز سے مسلّم ہو کر اس کو ملیں گے۔ اسی طرح واعظوں کو وعظ اور مرشدوں کو رہنمائی کی اُسی وقت اجازت ہوگی جب وہ مرکز کا پروانہ رکھتے ہوں گے۔

آخر میں پھر تصریح کر دیتا ہوں کہ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں مرکز کو اللہ و رسول کہتا ہوں، بلکہ میرا مطلب یہ ہے اجتماعی لحاظ سے مرکز ہی کی اطاعت کو قرآن، اللہ و رسول کی اطاعت قرار دیتا ہے، بشرطیکہ مرکز قرآن کے مطابق ہو۔

میں قرآن کی تشریح کا خود قرآن ہی سے قائل ہوں، اسی بنا پر اللہ و رسول کا یہ مفہوم کہ اس سے مراد مرکز یعنی امامِ وقت ہے۔ چند آیات ہی سے واضح کیا ہے جو اہلِ بصیرت کے لئے کافی ہیں۔ اور اگر ضرورت داعی ہوئی تو اور بھی متعدد آیات سے تفصیل پیش کرنے کی گنجائش، مگر عام اہلِ اسلام قرآنی الفاظ کی تفسیر میں مفسّرین کے اقوال کی بھی سند چاہتے ہیں اور مدتہائے دراز سے اس کے خوگر ہو رہے ہیں اس لئے اُن کی تسکینِ خاطر کے واسطے چند ائمہ تفسیر کے اقوال بھی نقل کئے دیتا ہوں جنہوں نے اللہ و رسول کے معنی امامِ وقت کے لئے لکھے ہیں۔

(۱) امام ابن جریر طبری سورۂ انفال کی پہلی آیت میں قُلِ الْأَنفَالُ لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد اپنا فیصلہ یہ لکھتے ہیں۔

واولی هذه الاقوال بالصواب فی معنی الانفال قول من قال هی زیادات یزیدها الامام لبعض الجیش اوجمیعهم۔

انفال کے معنی کے متعلق ان تمام اقوال میں سے قرین صواب ان لوگوں کا قول ہے جنہوں نے کہا ہے کہ یہ وہ اضافے ہیں جو امام وقت بعض یا کل فوج کے لئے کرتا ہے۔

یہاں انفال کے معنی سے بحث نہیں۔ مدعا صرف یہ ہے کہ اللہ و رسول کی تفسیر انہوں نے امام وقت لکھی ہے۔

(۲) امام رازی نے آیت ﴿ إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا۟ ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ ﴾ کے تحت میں امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

قال ابوحنیفة اذا قتل واخذ المال فالامام مخیّر فیه بین ثلاثة اشیاء

امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ اگر باغی یا ڈاکو نے قتل بھی کیا ہے اور مال بھی لیا ہے تو امام کو اختیار ہے کہ تینوں سزاؤں (قتل، قطع اور صلب) میں سے جو سزا چاہے اُس کو دے۔

(۳) اسی آیت کی تفسیر میں علامہ جلال الدین سیوطی الدر المنثور میں یہ روایت درج کرتے ہیں۔

عن سعید بن المسیب والحسن والضحاک قالوا الامام مخیّر فی المحارب یصنع به مایشاء۔

سعید بن مسیب، حسن بصری اور ضحاک نے کہا ہے کہ محارب کے معاملہ میں امام کو اختیار ہے جو چاہے کرے۔

(۴) یہی امام محی السنۃ بغوی نے معالم التنزیل میں لکھا ہے اور فتح البیان میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم لکھتے ہیں۔

قال ابن عباس وسعید بن المسیب ومجاهد وعطاء والحسن البصری وابراهیم النخعی والضحاک وابوثور من شهر السلاح فی قبة الاسلام واخاف السبیل ثم ظفر به وقدر علیه فامام المسلمین فیه بالخیار۔

حضرت ابن عباسؓ۔ سعید بن المسیب، مجاہد، عطاء، حسن بصری، ابراہیم نخعی، ضحاک اور ابوثور نے کہا ہے کہ جس نے اسلامی محروسہ میں ہتھیار اٹھایا اور راستوں کو پُرخطر کر دیا پھر وہ گرفت میں آیا اور پکڑا گیا اس کے بارے میں مسلمانوں کے امام کو اختیار ہے (جو سزا چاہے دے)

ان اقوال سے دو باتیں ظاہر ہو گئیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ و رسول سے مراد امام وقت ہے اور دوسری یہ کہ یہ احکام آنحضرت صلعم کی ذات یا زندگی تک محدود نہیں تھے بلکہ دائمی ہیں اور یہی دونوں باتیں میں نے آیات سے واضح کی ہیں۔

—————— (٭) ——————

تکملہ اس مضمون کے متعلق بعض لوگوں نے زبانی اور بعض لوگوں نے بذریعہ تحریر مختلف قسم کے سوالات کئے۔ جن سے میں نے اندازہ کیا کہ یہ توضیح طلب ہے اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ ان میں سے معقول سوالات کو چُن کر ترتیب کے ساتھ معہ اُن کے جوابات کے لکھوں تاکہ مسئلہ کی حقیقت واضح ہو جائے۔

(۱)

سوال:- تم کہتے ہو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک پیغمبری جس کے ذریعہ سے قرآن ملا——

دوسری امامت یعنی ملّت کی مرکزیت جو آپ کی ذات سے قائم ہوئی۔ اتباعِ قرآن کی شرعی حیثیت مسلّم ہے مگر مرکز تو ایک دنیاوی ادارہ ہے۔ اگر نہ ہو، جیسا کہ آجکل ہے، تو اس سے مسلمانوں کے اسلام میں کیا خرابی آتی ہے؟

جواب:۔ بلا مرکز کے ملّت کے مقاصد متعین نہیں ہوتے اور نہ اس میں اجتماعی عملِ صالح کی حرکت پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ بیابان کے ریگ کے ذرّوں کی طرح منتشر رہتی ہے جو ہر ہوا اور آندھی کے ساتھ جدھر کی بھی ہوا اُڑتی رہتی ہے۔ قرآن اُمت کا ایمان ہے اور مرکز اس کا اجتماعی عمل۔

قرآن میں اللہ و رسول و اولوالامر کی اطاعت کے احکام جو مسلمانوں کو دیئے گئے ہیں، وہ اس بات کی دلیل ہیں کہ مرکز کی حیثیت بھی شرعی ہے اور وہ محض دنیاوی ادارہ نہیں ہے، ملّت امام کے بغیر ایسی ہی ہے، جیسے جسم سر کے بغیر، جس کا انجام ہلاکت ہے۔

(۲)

سوال:۔ اللہ و رسول اور اولوالامر کی اطاعت بلا مرکز کے بھی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ قرآن و سنّت اور علماء کی اطاعت کی جائے۔ جیسی کہ آجکل ہم کر رہے ہیں۔

جواب:۔ اور اس کی سزا بھی بھگت رہے ہیں کہ باوجود اپنی کثرتِ تعداد کے اور باوجود عالم میں اپنی زبردست جغرافی حیثیت کے اور باوجود اس کے کہ اسلام میں تمام تر بہادر اور جنگ آور قومیں داخل ہیں جن کے پس پشت عظیم الشان تاریخیں ہیں پھر بھی دوسروں سے کمزور اور ذلیل و خوار ہیں؛ بلکہ اُمت کا بیشتر حصّہ شرک اور کفر کا محکوم اور غلام ہے جو اسلام کا جزو صالح نہیں کہا جا سکتا۔ یہ نتیجہ ہے زندہ مرکز نہ ہونے کا۔ اللہ و رسول کی اطاعت کے لئے قرآن و حدیث کو لے لیا کہ جس طرح چاہیں اُن پر عمل کریں یا نہ بھی عمل کریں، تو اطاعت کا مطالبہ کرنے والا کون ہے۔ رہے علماء تو اُن کا حلقہ اثر محدود ہوتا ہے جس سے مرکزیت نہیں پیدا ہو سکتی۔ علاوہ بریں وہ خود اکثر آپس کی مخالفتوں کی وجہ سے ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق میں مبتلا رہتے ہیں اور اُمت میں اور زیادہ تفریق و انتشار کا موجب ہوتے ہیں۔ اللہ و رسول کی اطاعت صرف زندہ امام ہی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے جو ضروریاتِ زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے قرآن کی روشنی میں اُمت کو اجتماعی مقاصد کی طرف لے چلے۔

(۳)

سوال:۔ تم نے اللہ و رسول کا مفہوم امام وقت ثابت کیا ہے لیکن علماء اس کے معنی کتاب و سنّت کے سمجھتے ہیں۔ کیا اللہ کے لئے یہ آسان نہ تھا کہ وہ ان دو لفظوں کے بجائے صرف ایک لفظ امام کہہ دیتا تاکہ یہ غلط فہمی نہ ہوتی۔

جواب:۔ قرآنی الفاظ مقصود کے مطابق ہوتے ہیں۔ صرف امام کا لفظ کہنے سے اسلامی مرکز کا صحیح مفہوم نہیں ادا ہو سکتا تھا کیونکہ امام کہتے ہیں پیشرو اور راہبر کو خواہ کسی قسم کا ہو۔ لغوی معنی کے لحاظ سے آج ہٹلر[1] بھی جرمن قوم کا امام ہے۔ لیکن اللہ کو بیان کرنا مقصود ہے اس امام کا جو قرآنی احکام کو نافذ کرنے والا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ

---

[1] اُس وقت ہٹلر موجود تھا۔

وسلم کے منصبِ امامت کا چارج لینے والا ہو۔ یہ مفہوم صرف اللہ و رسول ہی کے لفظ سے ادا ہو سکتا تھا جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اُسی کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔

(۴)

سوال :- پھر بھی یہ بات حل طلب رہی کہ علماء نے اللہ و رسول سے مرکزِ ملت کیوں نہ سمجھا؟

جواب :- میں نے اپنے مضمون میں ایسے مفسروں کے نام لکھے ہیں جنہوں نے اللہ و رسول سے امامِ وقت ہی سمجھا ہے۔

بے شک عرصۂ دراز سے استبداد کے تسلط اور جامد تقلید نے علماء کے زاویہائے نگاہ بدل دیئے ہیں وہ دین اسی کو سمجھتے ہیں کہ کتاب و سنت بلکہ ائمہ کی فقہ پر عمل کرتے رہیں۔ حالانکہ اس سے اجتماعی زندگی نہیں پیدا ہو سکتی، حیاتِ ملّی کے لئے قرآن کے ساتھ زندہ امام کی اطاعت بھی ضروری ہے۔

(۵)

سوال :- ایک سُنّی مولانا نے کہا کہ کیا ضمانت ہے کہ امامِ وقت غلطی نہ کرے گا۔

جواب :- کیا آپ کے عقیدہ کے مطابق حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما معصوم تھے؟ اگر نہیں تھے تو ان کو خلیفۂ رسول بناتے وقت یہ سوال اُمت نے کیوں نہیں اُٹھایا؟

مگر یہ جواب الزامی ہے، تحقیقی جواب یہ ہے کہ غلط اور صحیح کے جو معنی عرفِ عام میں ہیں کہ جو حقیقت کے خلاف ہو وہ غلط ہے اور جو حقیقت کے مطابق ہو وہ صحیح ہے، وہ نظامِ حکومت اور قانونِ عدالت میں نہیں ہیں۔ یہاں غلط وہ ہے جو بے ضابطہ ہو اور صحیح وہ ہے جو با ضابطہ ہو، ہمارے اصولیین نے بھی یہی لکھا ہے کہ قاضی اگر کسی مقدمہ کا فیصلہ اسلامی قوانین و ضوابط کے مطابق کردے تو چاہے وہ حقیقت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو شرعاً نافذ ہوگا، بلکہ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ القضاء نافذ ظاہراً و باطناً یعنی نہ صرف شرعاً بلکہ اللہ کے نزدیک بھی۔

ظاہر ہے کہ امامِ اُمت کا قابل ترین یا بہترین شخصوں میں سے ایک ہوگا جس کے ساتھ قرآن کی روشنی اور مشورہ کے لئے منتخب جماعت بھی ہوگی۔ پھر ساری اُمت کے اربابِ علم و عقل بھی اصلاح کا خیال رکھیں گے۔ ان سب کے بعد بے ضابطگی تو ہو ہی نہیں سکتی اور عرفی غلطی کا بھی خطرہ کم رہ جاتا ہے۔

علاوہ بریں غلطی سے اس قدر خوف کیوں ہے۔ فطرت نے اس کو انسان کی سرشت میں اس واسطے رکھا ہے کہ وہ زیادہ چوکنا، ہوشیار اور خبردار رہے۔ اس لئے وہ انسان کی ترقی میں معاون ہے۔ اور قصداً نہ ہو تو اس سے جس قدر نقصان ہو جاتا ہے بعض حالتوں میں اس سے زیادہ نفع پہنچتا ہے، اور غلطیاں کر کرکے ہی لوگ بہت کچھ سیکھتے ہیں۔

(۰)

(اس کے بعد دو سوال شیعہ حضرات کی طرف سے بھی تھے لیکن ان کا تعلق چونکہ فرقہ وارانہ اختلافی عقائد سے

---

(۱) یعنی انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے۔ اس طرح وہ غلط فیصلہ بھی کر سکتا ہے لیکن جب قرآن کا معیار سامنے ہو تو غلطی کا ازالہ فوراً ہو سکتا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

ہے جنہیں اس وقت چھیڑنا مناسب نہیں اس لئے ہم نے انہیں حذف کر دیا ہے۔ طلوعِ اسلام)

وضاحت

اس مقالہ میں "مرکز" سے مراد اسلامی مملکت (خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت) کی سنٹرل اتھارٹی یا مرکزی حکومت ہے۔ اور "امام" سے مراد سربراہِ مملکت ——— اسلامی مملکت ——— اس کی مرکزی اتھارٹی اور سربراہِ مملکت سب قرآنی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے نظم و نسق سرانجام دیں گے اور اس کے مشورہ میں پوری اُمّت شامل ہوگی جس کا طریق حالات کے تقاضا کے مطابق طے کیا جائے گا۔ (طلوعِ اسلام)

علّامہ محمد اسلم جیراجپوریؒ، قرآنی فکر و بصیرت کے طائرِ پیش رس ہی نہیں ایک دیدہ ور مؤرّخ بھی تھے۔ ان کا سلسلۂ تاریخِ اسلام، جسے انہوں نے

تاریخ الاُمّت

کے نام سے مدوّن فرمایا تھا۔ سلیس اور مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا جامع ہے۔ یہ کئی درسگاہوں میں داخلِ نصاب ہو چکا ہے۔ ادارہ نے اس پورے سلسلہ کو بڑی محنت سے شائع کیا ہے۔ تفصیل حسبِ ذیل ہے:۔

(۱) جلد اوّل	(سیرت نبی اکرم ﷺ)	قیمت -/۴ روپے	(۵) جلد پنجم	(خلافتِ عباسیہ (بغداد)	قیمت -/۴ روپے
(۲) جلد دوم	(خلافتِ راشدہ)	" -/۴ "	(۶) جلد ششم	(تاریخِ مصر)	" -/۴ "
(۳) جلد سوم	(خلافتِ بنی اُمیّہ)	" -/۴ "	(۷) جلد ہفتم	(آلِ عثمان)	" -/۴ "
(۴) جلد چہارم	(خلافتِ عباسیہ)	" -/۴ "	(۸) جلد ہشتم	(پوری تاریخ پر عالمانہ تبصرہ)	" -/۴ "

قیمت (مکمل سیٹ) -/۳۲ روپے (علاوہ ڈاک خرچ)

ملنے کا پتہ } (۱) مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور (۲) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

علامہ محمد اسلم جیراجپوری علیہ الرحمۃ

قانونِ وراثت

(حضرت علامہ کا یہ مضمون، ان نوادرات بلکہ تبرکات میں سے ہے۔ ذہن پر کافی زور دینے کے بعد بھی میں حتمی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے اس کا مسودہ مجھے کب مرحمت فرمایا تھا۔ کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ یہ تقسیم ہند کے قریب کی بات ہے۔ تقسیم ملک کے عواقب میں جو افراتفری مچی تھی اس سے بہت کچھ تلف اور بہت کچھ ادھر اُدھر ہو گیا۔ انہی میں یہ مسودہ بھی تھا۔ یتیم پوتے کی وراثت کے سوال نے جو اہمیت اختیار کی تو اس سے اس کی یاد تازہ ہو گئی۔ اور میری انتہائی خوش قسمتی کہ یہ مجھے مل گیا، جسے میں بکمال فخر و مسرت شائع کر رہا ہوں۔ یہ میرے پاس بطور امانت رکھا تھا اور اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے اس لئے اسے بلا تصرف اور بلا تشریح و تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ چونکہ وراثت سے متعلق احکام زیادہ تر فنی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے عوام تو شاید اس مقالہ کی اہمیت کا کماحقہٗ اندازہ نہ لگا سکیں لیکن علمی طبقہ میں مجھے امید ہے، یہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

چونکہ علامہ مرحوم کی نگاہ قرآن اور فقہ دونوں پر تھی اس لئے انہوں نے جس انداز سے، قرآن مجید کی روشنی میں، فقہی قوانین کی کمزوریاں واضح کی ہیں، اس کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ بالخصوص یتیم پوتے کو محروم الارث قرار دینے کے فقہی قانون کا جس مدلل طریق سے ابطال کیا ہے، اس کے لئے قانون دان حلقہ یقیناً ان کا سپاس گذار ہوگا۔ ــــ پرویز)

قرآنِ کریم کی صرف چند آیات میں اللہ تعالےٰ نے وراثت کا مکمل قانون بیان کر دیا ہے جو حقیقت میں معجزہ ہے۔ کیونکہ مختصر اصولوں سے جملہ فروع اس فن کی نکل آتی ہیں۔ اور تمام مسائل جو فرائض یعنی علمِ وراثت سے متعلق ہیں حل ہو جاتے ہیں۔

فقہاءِ اسلام نے فنِ فرائض کی تدوین میں چونکہ احتیاط اور کامل غور و فکر کے ساتھ ان آیات پر نظر نہیں ڈالی اس وجہ سے ان کے بیان کردہ اصول بعض امور میں قرآنی آیات کے خلاف ہو گئے۔ جن کی وجہ سے موجودہ فقہ فرائض میں غلطیاں واقع ہو گئیں۔ اس لئے ہم آیاتِ وراثت کی تفصیل کرتے ہیں اور اسی ضمن میں فقہ فرائض میں جو غلطیاں ہوئی ہیں ان کو بھی بیان کر دیں گے۔

پہلی آیت

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۔ (۴/۷)

مردوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو والدین اور اقربا نے چھوڑا ہے اور عورتوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو والدین اور اقربا نے چھوڑا ہے۔ خواہ اس میں سے کم ہو یا زیادہ۔ ایک معین حصہ۔

یہ آیت میراث کے قانون کی تمہید ہے۔ اور اس سے جاہلیت کا دستور مٹایا گیا ہے جس کی رُو سے مرد اپنے والدین یا اقربا کے ترکہ پر قابض ہو جاتے تھے اور عورتوں کو محروم کر دیتے تھے۔ یہ جاہلیت کا ایک کھلا ہوا ظلم تھا۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں تصریح فرما دی کہ وراثت کی علت قرابت ہے جس میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔ جس طرح میت کے ترکہ سے مرد قرابت دار حصہ پاتے ہیں اسی طرح عورتیں بھی پائیں گی۔ اگرچہ ان کے حصوں میں من حیث قلت اور کثرت کے تفاوت ہوگا جیسا کہ ان کے حصص کی تفصیل میں بیان کیا جائے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی قرابتدار مرد کسی میت کا وارث ہو جائے اور اس درجہ کی قرابت دار عورت وارث نہ ہو۔

اس تمہیدی آیت کے برخلاف ہمارے فقہا نے چچا اور بھتیجے اور چچا کے بیٹے کو تو اپنے اصول کے مطابق عصبہ قرار دے کر وارث بنا دیا ہے اور چچا کی حقیقی بہن یعنی پھوپھی نیز بھتیجی اور چچا کی بیٹی کو ذوات الارحام قرار دے کر ان کے مقابلہ میں محروم کر دیا ہے۔ حالانکہ قرابتیں چچا کی اور پھوپھی کی اور بھتیجے اور بھتیجی کی۔ نیز چچا کے بیٹے کی اور بیٹی کی ایک ہی درجہ کی ہیں۔

اسی طرح نانی ان کے نزدیک ذوی الفروض میں داخل ہے جو نواسے کے متروکہ میں حصہ پاتی ہے اور نانا ذو رحم ہے جو عصبات اور ذوی الفروض کی موجودگی میں کوئی ترکہ نہیں پاتا۔ حالانکہ نانا اور نانی میاں بیوی ہیں اور نواسہ سے دونوں کی قرابت یکساں ہے۔

آیت میں لفظ وَالِدٰنِ اور اَقْرَبُوْنَ کا ہے۔ اقرب[1] کے معنے ہیں سب سے قریبی رشتہ دار۔ اس میں والدین بھی اگرچہ داخل ہیں لیکن ان کی فضیلتِ قرابت اور احسانِ تربیت کے باعث ان کا ذکر جداگانہ کر دیا ہے۔ یعنی اقربون ایک جنس ہے جس کی افضل نوع والدین ہیں۔ لہٰذا، یہ جنس پہلے نوع کا ذکر ہے۔ تکرار نہیں ہے اگر والدین کا ذکر نہ بھی ہوتا تو بھی آیت کا مفہوم مکمل تھا۔ صرف یہ کہ والدین کی افضلیت میں من حیث القرابت ظاہر نہ ہوتی۔

مطلب یہ ہوا کہ چونکہ رشتہ دار قرابت کے لحاظ سے میت سے قریب اور بعید ہوتے ہیں۔ مثلاً والدین۔ اولاد۔ اولاد کی اولاد۔ بھائی۔ بہن۔ چچا۔ پھوپھی۔ ماموں اور خالہ وغیرہ۔ اور یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ سب کے سب خواہ قریب ہوں یا بعید ایک ساتھ وارث ہوں اس لئے وراثت کا مدار "اقربیت" پر ہے۔ یعنی میت کے ترکہ میں سے اسی کو حصہ ملے گا جس کا وہ اقرب ہوگا۔ قرآن کا لفظ یہی ہے کہ اقربا جو چھوڑ کر مریں اس میں سے مردوں اور عورتوں کو حصہ ملے گا۔ یہ نہیں ہے کہ میت کے اقربین کو حصہ دیا جائے گا۔ اس نازک فرق کو نظر انداز کرنے سے مدونین فقہ کے وقت یہ اصول بنا یا گیا کہ میّت کا قریبی رشتہ دار اپنے سے دور کے رشتہ دار کو محروم کر دیتا ہے۔ اور اس اصول کی بنا پر یتیم پوتے کو دوسرے بیٹے کی موجودگی میں محجوب الارث قرار دیا گیا۔ مثلاً

---

[1] لفظ اقرب کی تشریح ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔ (طلوعِ اسلام)

مسئلہ ۱

اس طرح کمزور یتیم بچوں کو اسلام کے منشا کے خلاف جو دین الرحمۃ اور دین الفطرۃ ہے اپنے آباء و اجداد کی کمائیوں سے بلا وجہ ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا جاتا ہے۔

بحث حجب

ہم جہاں تک غور کرتے ہیں قرآن اور حدیث تو خیر، خود فقہ بھی یتیم پوتے کو اصولاً نہیں محجوب کرتی ہے۔ فقہا نے حجب حرمان کو دو اصولوں پر مبنی قرار دیا ہے۔

۱۔ جو شخص مورث کے ساتھ کسی دوسرے شخص کے واسطہ سے رشتہ رکھتا ہے وہ اس وقت تک وراثت نہیں پا سکتا جب تک وہ درمیانی شخص موجود ہے۔

۲۔ الاقرب فالاقرب۔ یعنی قریب کے رشتہ کے ہوتے ہوئے، اس سے دور کا رشتہ دار محروم رہتا ہے۔ پہلا قاعدہ جس کو مختصر لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ واسطہ کی موجودگی میں ذی واسطہ وارث نہیں ہوتا۔ یتیم پوتے کو کسی طرح محجوب نہیں کرتا۔ کیونکہ پوتے کو دادا کے ساتھ جو رشتہ ہے وہ بذریعہ اپنے باپ کے ہے۔ اور جب باپ جو واسطہ، قرابت تھا موجود ہی نہیں تو پھر پوتا کیوں محروم ہونے لگا۔

دوسرا قاعدہ الاقرب فالاقرب ہے۔ اسی میں غلط فہمی واقع ہوئی ہے۔ اس کے ظاہری معنے کا خیال کر کے فقہاء نے یہ سمجھا کہ بیٹا جو قریبی رشتہ دار ہے یتیم پوتے کو جو اس سے دور کا رشتہ دار ہے محجوب کر دے گا۔ دراصل یہی اور صرف یہی ایک قاعدہ ہے جس کی بنیاد پر یتیم اولاد محجوب قرار دی جاتی ہے۔ لہٰذا، ہم اپنی بحث کا مرکز بھی اسی قاعدہ کو قرار دیتے ہیں۔ اگر یہ قاعدہ "الاقرب فالاقرب" اپنے ظاہری معنوں میں رکھا جائے۔ یعنی یہ کہ مطلقاً درجہ کے لحاظ سے جو قریب ہو وہ بعید کو محروم کر دے تو وراثت کے بہت سے مسئلہ اور اجماعی مسائل ٹوٹ جائیں گے۔

مسئلہ ۲

مثال ۱

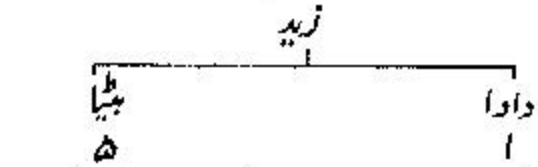

اس مثال میں بیٹے کی موجودگی میں دادا کو حصہ ملا ہے۔ حالانکہ بیٹا بہ نسبت دادا کے اقرب ہے۔ کیونکہ وہ بلا واسطہ میت سے رشتہ رکھتا ہے اور دادا بواسطہ باپ کے اس کا رشتہ دار ہے۔

مسئلہ ۳

مثال ۲

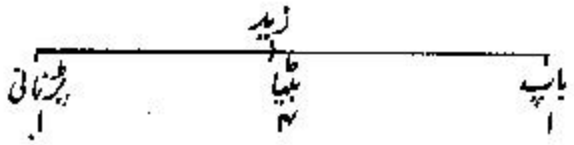

یہاں بیٹے اور باپ کے ہوتے ہوئے جو اقرب تھے پڑنانی حصہ لے گئی جو نہایت دور کی رشتہ دار ہے۔

حضرت عمرؓ کو اس پر تعجب تھا کہ بھتیجا پھوپھی کا وارث ہوتا ہے اور پھوپھی بھتیجے کی وارث نہیں۔ لیکن اگر موجودہ فقہ ان کے سامنے ہوتی تو ان کو اور بھی حیرت ہوتی کہ نانی بلکہ پڑنانی تک نواسہ کے ترکہ میں حصہ پاتی ہے اور نواسہ ان میں سے کسی کا بھی ترکہ نہیں پاتا۔ اور تعجب پر تعجب یہ ہے کہ ماں جو کمزور وارث ہے وہ تو دادی کو محروم کر دیتی ہے اور باپ جو قوی وارث ہے نانی کو محروم نہیں کر سکتا۔ دادا محجوب الارث پوتے کا وارث ہوتا ہے اور پوتا دادا کا وارث نہیں ہوتا۔

مسئلہ ۶

مثال ۳

زینب

شوہر	ماں	دو اخیافی بھائی	دو حقیقی بھائی
۳	۱	۲	۲ محروم

اس مثال میں کسی قاعدہ کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ حجب حرمان کا پہلا قاعدہ یہ چاہتا تھا کہ دونوں مادری بھائی جو ماں کے واسطہ سے رشتہ رکھتے ہیں اس کی موجودگی میں محروم ہوں۔ لیکن نہیں ہوئے۔ دوسرا قاعدہ بھی یہی چاہتا تھا کہ ماں جو قریبی رشتہ دار ہے مادری بھائیوں کو محروم کر دے، لیکن نہیں کر سکی۔ حقیقی بھائی جو قوتِ قرابت کے لحاظ سے اقوی اور اقرب تھے وہ بھی ان کو نہیں محروم کر سکے بلکہ اُلٹے ان کی وجہ سے خود محروم ہو گئے۔

مسئلہ ۱۸

مثال ۴

زید

دو بیٹیاں	دو پوتیاں	پڑپوتی	سکڑپوتی	سکڑپوتا
۱۲	۲	۱	۱	۲

اس صورت کو فقہاء مسئلہ تشبیب کہتے ہیں۔ اس میں بیٹیاں اقرب ہیں۔ ان کی موجودگی میں نیچے والیوں کو محروم ہونا چاہیے ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف پوتی ـــ سکڑپوتی اور سکڑپوتا جو سب نیچے اوپر مختلف درجہ کے ہیں آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بہن قرار دے دیئے گئے اور سب کو ترکہ میں سے حصہ ملے گا۔ ان متعدد اور مختلف قسم کی مثالوں سے صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ قاعدہ الاقرب فالاقرب اپنے ظاہری معنے میں، کہ درجہ کے لحاظ سے جو قریب ہے وہ ابعید کو محروم کر دے، نہیں لیا جا سکتا۔ ورنہ خود فقہ کے یہ اجماع اور مسلّم مسائل ٹوٹ جائیں گے۔

اب یہ صاف روشن ہو گیا کہ الاقرب فالاقرب کا قاعدہ جس معنے میں فقہاء نے لیا ہے۔ کسی تاویل سے ٹھیک نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر پہلو سے خود انہیں کے مسلمات سے ٹوٹ جاتا ہے۔ لہٰذا ایسے قاعدہ سے جو ایک قدم بھی نہیں چل سکتا یتیم اولاد کو محجوب کرنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔

اقرب کا صحیح مفہوم

اصلیت یہ ہے کہ میت اس کا اقرب ہے جس سے یا تو بلاواسطہ اس کا رشتہ ہو یا بالواسطہ لیکن بوقتِ اس کی وفات کے وہ واسطہ موجود نہ ہو۔ جس طرح کہ میت

کی وفات کے وقت اگر اس کا باپ موجود نہیں ہے تو دادا بجائے باپ کے وارث ہوتا ہے۔ اس لئے کہ بیچ میں جو واسطہ تھا یعنی باپ جس کی وجہ سے دادا محجوب ہو جاتا تھا، وہ نہیں ہے۔ لہٰذا اس واسطہ کی عدم موجودگی میں میت دادا کا اقرب ہو گیا۔ اور اب کوئی اقرب خواہ وہ بیٹا ہی کیوں نہ ہو دادا کو محجوب نہیں کر سکتا۔ بعینہٖ اسی طرح مورث کی وفات کے وقت اگر اس کا کوئی یتیم پوتا ہے تو وہ اپنے متوفی باپ کو جگہ دکھا جائے گا۔ اور وہی حصہ لے گا جو اس کے باپ کا تھا۔ مورث کا دوسرا بیٹا جو موجود ہے وہ اس کو محجوب نہیں کر سکتا۔ کیونکہ باپ کی عدم موجودگی سے اس یتیم پوتے اور میت کے درمیان سے واسطہ اٹھ گیا ہے اور میت اس کا اقرب ہو گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وراثت کا سارا دارومدار قائمقامی پر ہے۔ لہٰذا جس بچہ کا باپ مر چکا ہے وہ دادا سے وراثت لینے میں اس کا قائمقام سمجھا جائے گا۔ فقہا نے اس سلسلہ میں اسی اصل نکتہ یعنی قائم مقامی کا لحاظ نہیں رکھا، جس کی وجہ سے ایسی عظیم الشان غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ یتیم بچوں کو محجوب کرنے لگے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ جس بیٹے کی موجودگی کی وجہ سے یتیم پوتے کو فقہاء محجوب کرتے ہیں وہ بیٹا صرف ایک ہی طرف سے کیوں حاجب ہوتا ہے۔ یعنی صرف پوتے ہی کو دادا کے ترکہ سے کیوں محجوب کرتا ہے۔ دادا کو اس پوتے کے ترکہ سے کیوں محجوب نہیں کرتا۔ بلکہ دادا کی وجہ سے خود ہی الٹا محروم ہو جاتا ہے۔ اس سے صاف سمجھ میں آجاتا ہے کہ قائمقامی کے اصول پر وہ کسی طرح پوتے کا حاجب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ میت کے ساتھ پوتے کی قرابت کا واسطہ نہیں ہے۔

حاصل یہ کہ اقرب کا سوائے اس کے جو ہم نے بیان کیا ہے اور کوئی مفہوم ہو ہی نہیں سکتا اور فقہاء نے الاقرب فالاقرب کا قاعدہ جو بنایا ہے وہ اسی معنے سے صحیح ہو سکتا ہے۔ اور یہ معنے لینے سے یتیم اولاد محجوب نہیں ہو سکتی۔[1]

اصلیت یہ ہے جیسا کہ پہلے اشارہ کر چکا ہوں قرآن کریم نے اس آیت میں بھی اور دوسری آیت: وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ (۴/۳۳) "والدین اور اقربا جو کچھ چھوڑ مریں اس کے وارث ہم نے مقرر کر دیئے ہیں" میں بھی اقرب مورث قرار دیا ہے۔ یعنی جن لوگوں کا وہ اقرب ہوگا وہ لوگ وراثت پائیں گے۔ فقہا نے اقرب کا استعمال ورثہ کے لئے کیا جس سے بہت سی غلطیوں میں پڑ گئے۔ قرآن کے بیان کئے ہوئے لفظ کے بعد صرف ہم کو یہ متعین کرنا تھا کہ میت کس کس کا اقرب ہوتا ہے۔ اور کسی قاعدہ بنانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ فقہ نے لفظ اقرب کی نسبت میں غلطی کی اور پھر جو قواعد اس پر متفرع کئے ان پر عمل کرنا ممکن نہ ہوا۔ چنانچہ حجب حرمان کا پہلا قاعدہ کہ واسطہ کی موجودگی میں ذی واسطہ وارث نہیں ہوتا جو سراجی کے الفاظ میں یوں ہے۔ "کل من یدلی الی المیت بشخص لا یرث مع وجود ذالک الشخص" یعنی جو کوئی میت کے ساتھ کسی شخص کے واسطہ سے وابستہ رکھتا ہے تو وہ اس شخص کی موجودگی میں ترکہ نہیں پاتا۔ صاف بتلاتا ہے کہ بہن بھائی کو باپ یا ماں کی موجودگی میں وراثت نہیں ملنی چاہیئے کیونکہ اس کا رشتہ میت کے ساتھ ان کے واسطہ سے ہے۔ مگر ہمارے فقہا دباپ کے ساتھ تو نہیں مگر ماں کے ساتھ بہن بھائی کو اپنے اصول اور قرآن کی آیت دونوں کے

---

[1] اس کی تفصیل دیکھنی ہو تو رسالہ "محجوب الارث" مصنفہ علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری ملاحظہ کیجئے جو مکتبہ جامعہ ملیہ۔ فرولباغ۔ نئی دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔

خلاف وارث بناتے ہیں۔

الغرض حجب حرمان کے دونوں قاعدے جو بنائے گئے ہیں وہ قدم قدم پر خود فقہاء کے عمل سے ٹوٹ جاتے ہیں۔

دوسری آیت

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا۔ (۴/۱۱)

تم کو تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ وصیت کرتا ہے کہ مذکر کو مؤنث کا دُگنا دو۔ اگر دو سے اُوپر بیٹیاں ہوں تو اُن کو ترکہ کا دو ثلث ملے گا۔ اور اگر ایک ہی (بیٹی) ہو تو اس کو نصف اور اس کے (میت کے) باپ ماں سے ہر ایک کو اس کے ترکہ کا چھٹا حصہ ملے گا۔ اگر اس نے کوئی بچہ (نر یا مادہ) چھوڑا ہو۔ ہاں اگر اس کے کوئی بچہ نہ ہو اور اس کے وارث اس کے باپ ماں ہوں تو اس کی ماں کو ایک ثلث اور اس کے بھائی بہن ہوں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ ——— یہ وصیت کے بعد ہے جو کی جائے یا قرض (کے بعد) تمہارے باپوں اور بیٹیوں میں سے تم کو کیا خبر کہ کون تم کو زیادہ نفع پہنچانے والا ہے۔ یہ اللہ کا فریضہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نسبی ورثہ میں سے ماں باپ اور اولاد کے حصے بیان فرمائے ہیں۔ اولاد کا لفظ ہر ولد کو جو موجود ہو قریب ہو یا بعید ہو۔ مذکر ہو یا مؤنث شامل ہے۔ اور آیاتِ وراثت میں جہاں بھی ولد کا لفظ آیا ہے اس کے متعلق فقہاء کا اجماع ہے کہ اس میں مورث کی اولاد اور اولاد کی اولاد سب داخل ہے۔ بعض لوگوں نے اسی لفظ کو بیٹا اور بیٹی کے لئے حقیقی کہا ہے اور نیچے کی اولاد کے لئے مجازی اور بعض نے کل اولاد اعلیٰ و اسفل کے لئے اس کا استعمال حقیقی قرار دیا ہے ——— اور یہی حق ہے ——— کیونکہ ولد کا لفظ ولادت سے متعلق ہے اس لئے ہر ایک ولد اعلیٰ سے اسفل تک حقیقتاً اولاد ہے۔ یعنی اولاد کی اولاد بھی اولاد ہے جیسے جزء کا جزء بھی جزء ہے۔

اللہ نے ہم کو ہماری اولاد کی وراثت کے بارے میں یہ وصیت کی کہ جب وہ نر و مادہ دونوں ہوں اس وقت نر کو مادہ کا دُگنا حصہ دو۔ اور مادہ کو نر کا نصف۔ اور جو ایک ہی بیٹی ہو تو اس کو نصف ترکہ۔ اور جو بیٹیوں سے اوپر ہوں تو ان کو دو ثلث ——— بقیہ مسائل میں خاموشی اختیار کی۔ مثلاً صرف بیٹے۔ یا دو بیٹیاں وغیرہ تاکہ علماء کو معلوم ہو کہ قیاس شروع ہے اور وہ اپنی عقل سے کام لے کر بقیہ مسائل خود انہی معلومات سے حاصل کرلیں۔

سو بیٹیوں کا حکم ہم نے اس طرح مستنبط کیا کہ جب ایک بیٹی کا حصہ نصف ہے۔ اور نر کو مادہ سے دُگنا ملتا ہے تو

اگر ایک بیٹا ہوگا تو اس کو کل مال ملے گا اور جب ایک بیٹا پورے مال کا وارث ہو سکتا ہے تو ایک سے زائد بیٹے بدرجہ اولیٰ پورے ترکہ کو لے لیں گے۔

اور دو بیٹیوں کا حکم اس طرح سمجھ میں آگیا کہ ایک بیٹی جب ایک بیٹے کے ساتھ ہو تو اس کو ایک ثلث ملے گا۔ اور جب ایک بھائی کے ساتھ وہ ثلث پاتی ہے تو ایک بہن کے ساتھ ثلث کیوں نہ پائے گی۔ اس لئے دو بیٹیوں کا حصہ دو ثلث ہوگا۔ اور دو ثلث سے زیادہ اس لئے نہیں ہو سکتا کہ دو بیٹیوں سے زیادہ ہوں تو ان کو بھی دو ہی ثلث قرآن دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت میں فَوْقَ اثْنَتَيْنِ کا لفظ استعمال کیا اور دو سے زیادہ بیٹیوں کا حصہ بیان کیا۔ جس سے دو بیٹیوں کا حصہ بلد بیان کئے ہوئے سمجھ میں آگیا۔ لیکن اگر وہ دو کا بیان کرتا تو دو سے زیادہ کا سمجھ میں نہ آتا۔

والدین یعنی باپ اور ماں کے ساتھ اگر میت نے اپنی کوئی اولاد بھی چھوڑی ہے تو باپ کو چھٹا حصہ ملے گا اور ماں کو بھی۔ اور اگر میت نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی ہے تو ماں کو ثلث ملے گا۔ اور باپ کے حصہ سے خاموشی اختیار کی، کیونکہ باقی دو ثلث اس کے سوا کس کو مل سکتا ہے جبکہ کوئی دوسرا وارث نہیں ہے۔

چونکہ باپ اور ماں میت سے ایک ہی قرابت رکھتے ہیں اور باپ کو اولاد کی تربیت اور شفقت میں ماں پر فضیلت حاصل نہیں ہے اس لئے میت کی اولاد کی موجودگی میں جبکہ وہ محض باپ ماں ہونے کی حیثیت سے وراثت پاتے ہیں ان کے حصے برابر رکھے یعنی ایک ایک سدس۔ لیکن میت نے اولاد نہیں چھوڑی اس وقت اولاد کا حصہ بھی باپ ہی کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس لئے ان کے حصوں میں وہی تفاوت رکھا جو بیٹا اور بیٹی کے حصوں میں ہے۔ یعنی ماں کو ایک ثلث اور باپ کو دو۔

اور اگر میت کے بھائی یا بہن (دونوں ہوں)۔ ایک یا زیادہ کیونکہ اخوۃ کا لفظ اگرچہ جمع ہے لیکن مراد اس سے جنس ہے تعداد نہیں ہے۔ تو پھر ماں کو ایک سدس ملے گا۔ اور باقی پانچ سدس باپ کے ہوں گے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے: فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ (وَالْبَاقِيْ لِلْاَبِ) وَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ (والباقی للاب)۔ اگر میت کے کوئی بچہ نہ ہو اور اس کے وارث اس کے ماں اور باپ ہوں تو اس کی ماں کو ثلث ملے گا اور باقی باپ کو۔ اور اس کے بھائی بہن ہوں تو ماں کو سدس ملے گا اور باقی باپ کو۔ بھائی بہن کو خواہ وہ کسی قسم کے ہوں نہ باپ کی موجودگی میں کچھ مل سکتا ہے اور نہ ماں کی۔ کیونکہ ان کو قرآن نے صرف کلالہ کا وارث ٹھہرایا ہے جیسا کہ چوتھی آیت کی تفصیل میں آئے گا۔

اور یہ توریث وصیت کے نفاذ کے بعد ہوگی۔ یعنی وصیت جو مورث نے کی ہو وہ مقدم ہے اس کے بعد اگر کچھ بچے گا تو اس میں قانونِ وراثت جاری ہوگا۔ ورنہ وصیت ہی کافی سمجھی جائے گی فقہا نے وصیت کو بھی ثلث مال میں محدود کر دیا ہے لیکن ان کے پاس کوئی قرآنی دلیل نہیں ہے بلکہ ان کا قول قرآن کے خلاف ہے۔ کیونکہ قرآن میں ہے: مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ یعنی کوئی وصیت جو کی گئی ہو خواہ ثلث مال کی یا کل کی اس کے بعد توریث کی آیت پر عمل ہوگا۔ اور وصیت سے بھی مقدم ہے قرض۔ یعنی مورث نے اگر اپنے ذمہ قرض چھوڑا ہے تو اس کے متروکہ سے سب سے

پہلے وہ ادا کیا جائے گا ـــــ لفظاً اللہ تعالیٰ نے دین کو وصیت سے مؤخر کیا ہے اس تنبیہ کے لئے کہ مسلم کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ مرتے وقت مقروض ہو ـــــ اس لئے اَوْ یعنی یا کا لفظ استعمال کیا۔ مطلب یہ ہوا کہ بعد وصیت کے یا قرض کے اگر کوئی قرض ہو۔

آخر میں یہ بتایا کہ یہ حصوں کی تعین تم اپنی عقل سے نہیں کر سکتے تھے اس لئے ہم نے یہ حصص مقرر کر دیئے ۱۰ یہ ہماری طرف سے فریضہ ہے وراثت میں۔

تیسری آیت

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم مِّن بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ وَإِن كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَإِن كَانُوا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ (۴/۱۲)

تم کو نصف ملے گا تمہاری بیویوں کے ترکہ سے اگر ان کے کوئی اولاد نہ ہو تو تم اس کو اس کے متروکہ کا چوتھائی ملے گا۔ یہ اس وصیت کے بعد ہوگا جو وہ کر جائیں یا قرض کے اور بیویوں کو تمہارے ترکہ سے چوتھائی ملے گا اگر تمہارے کوئی اولاد نہ ہو۔ اور اگر تمہارے اولاد ہو تو ان کو تمہارے ترکہ کا آٹھواں حصہ ملے گا۔ یہ اس وصیت کے بعد ہوگا جو تم کر جاؤ یا قرض کے۔

اور اگر کوئی مرد کسی کلالہ کا وارث بنایا جائے یا کوئی عورت۔ درآنحالیکہ اس کلالہ کے بھائی یا بہن بھی ہو تو اس مرد اور عورت میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور اگر وہ ایک سے زائد ہوں تو سب ثلث میں شریک ہوں گے۔ یہ اس وصیت کے بعد ہوگا جو کی جائے یا قرض کے۔ بلا کسی کو نقصان پہنچائے۔ یہ اللہ کی طرف سے وصیت ہے اور اللہ صاحب علم اور صاحب حلم ہے۔

اس آیت میں سببی ورثہ کے حصے بیان کئے گئے ہیں۔ سببی ورثہ وہ ہیں جن کا تعلق میت سے سوائے نسب کے کسی اور ذریعہ سے ہو۔ ان کی دو قسمیں ہیں۔ عقدی اور عہدی۔ عقدی وہ ہیں جن کا رشتہ بذریعہ نکاح کے ہوتا ہے۔ اور وہ میاں بیوی ہیں۔ ان کے فرائض واضح ہیں۔

اور عہدی وہ ہیں جن کے ساتھ بعد موت کے وراثت کا عہد کر لیا جائے۔ قرآن کی اس آیت سے: وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ (۴/۳۳) "جن سے تمہارا پیمان بندھ جائے ان کو ان کے حصے دو" یہی ورثہ مراد ہیں۔ بعض فقہاء نے اس آیت کو منسوخ کہنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ بھی ان کی عام غلطیوں میں سے ایک غلطی ہے۔ قرآن کی کوئی آیت جب تک اللہ تعالیٰ خود نہ منسوخ کر دے کسی کے کہنے سے نہیں منسوخ ہو سکتی۔ چنانچہ امام ابو حنیفہؒ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ دو شخص اگر باہم دگر وارث ہونے کا

عہد باندھ لیں تو صحیح ہے۔

عہدی وارث بجز کلالہ کے دوسرے سے وراثت نہیں پا سکتا۔ کلالہ وہ ہے جس کے نہ باپ ماں ہوں، نہ اولاد ـــــ اگر ایسے عہد باندھنے والے کے باپ ماں یا اولاد میں سے کوئی بھی اس کے مرنے کے بعد موجود ہوگا تو وہ عہدی محروم ہو جائے گا۔ ہاں بہن یا بھائی کی موجودگی میں وہ محروم نہیں ہوتا۔ ایسے عہدی وارث کا حصہ سدس ہے اگر ایک ہو۔ اور جو ایک سے زائد ہوں تو سدس میں سے سب بحصہ مساوی شریک ہوں گے۔ اس میں مذکر اور مؤنث دونوں برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں۔ اور یہ سب وصیت کے نفاذ کے بعد ہوگا یا قرض کے۔ ایسی وصیت جس میں کسی کو نقصان نہ پہنچایا گیا ہو۔

فقہاء نے اس آیت کا حکم ہی بدل دیا ہے۔ انہوں نے اس کو مادری بھائی اور بہن کی وراثت کے لئے قرار دیا ہے۔ کیونکہ حضرت سعد بن وقاص۔ عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعب کی قرأت میں "اَخٌ اَوْ اُخْتٌ" کے بعد "لِاُمِّہٖ" کا لفظ روایت کرتے ہیں۔ اس بنا پر انہوں نے مادری بھائی اور بہن کو دونوں الفروض میں داخل کیا ہے اور اس پر ان کا اجماع ہو گیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک ان کا یہ استدلال صحیح نہیں ہے جس کی وجوہات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ یہ قرأت شاذ ہے۔ اور ہمارا ایمان قرآن کی اس متواتر عبارت پر ہے جو بین الدفتین ہے۔ وہ کسی کے قول یا روایت سے بدل نہیں سکتی۔ مشرق سے مغرب تک ساری اُمتِ مسلمہ میں سے کوئی ایک شخص بھی اس آیت میں "لِاُمِّہٖ" کا لفظ نہیں پڑھتا۔ اس لئے ایسے لفظ سے استدلال کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ جس کو ساری اُمت نے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اور یہ عجیب اجماع نقیضین ہے کہ ایک ہی وقت میں لفظاً اس کی عدم قبولیت پر اُمت کا اجماع ہے اور معناً قبولیت پر۔

۲۔ فقہاء اور مفسرین آیت میں "لَہٗ" کی واحد مذکر غائب کی ضمیر کو رجل اور امراۃ دونوں کی طرف راجع کرتے ہیں۔ جن میں سے امراۃ مؤنث حقیقی ہے وہ کبھی اس کا مرجع ہو ہی نہیں سکتی۔ اس صورت میں لھما یا لِکُلِّ وَاحِدٍ مِنْھُمَا چاہئے تھا۔

۳۔ اگر یہ آیت مادری بہن بھائی کی توریث کے لئے ہوتی تو کلام یوں ہوتا کہ "وَاِنْ یَّرِثُ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِکُلِّ وَاحِدٍ مِنْھُمَا السُّدُسُ"۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس طرز کو چھوڑ کر اطناب مہمل اختیار کیا۔ اس کا کلام تو اعجاز ہے۔

۴۔ اگر اس آیت سے بھائی بہن کی توریث مقصود تھی تو اللہ تعالیٰ نے "لِاُمِّہٖ" کیوں نہ فرمایا۔ وہ تو بھولنے والا نہیں۔ "وَمَا کَانَ رَبُّکَ نَسِیًّا" اور اگر کہا تھا تو حسبِ وعدہ کہ ہم قرآن کے محافظ ہیں اس کی حفاظت کیوں نہ کی۔ قانون سازی کے موقع پر جبکہ مقام تفسیر کا ہو اور کلام مبہم چھوڑ دیا جائے گویائی کا نقص ہے جس سے اللہ تعالیٰ کہیں بالاتر ہے۔

۵۔ بھائی بہن کی وراثت اللہ تعالیٰ نے اس سورہ کی آخری آیت میں بیان کی ہے جس میں مطلق اَخٌ اور اُخْتٌ کا لفظ ہے۔ اگر اس آیت میں ہم اخ و اخت کے لفظ کو "لِاُمِّہٖ" کے ساتھ مقید کر دیں۔ تو اس آیت میں بھی ان الفاظ کو

"لاب وام اولاب" کے ساتھ مقید کرنا پڑیگا۔ بلا کسی دلیل اور قرینہ کے جو کسی طرح قرآن میں روا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بھائی اور بہن کی تینوں قسموں یعنے حقیقی۔ علاتی اور اخیافی میں سے میراث کے سب سے پہلے حقدار حقیقی ہیں کیونکہ وہ میت کے ساتھ ماں اور باپ دونوں کے توسط سے قرابت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعد علاتی۔ جو باپ کے ذریعہ سے رشتہ رکھتے ہیں۔ پھر اخیافی جو ماں کے توسط سے قرابت رکھتے ہیں۔ فقہاء نے اخیافیوں کو ذوی الفروض میں داخل کرکے اور حقیقتوں اور علاتیوں کو عصبہ قرار دیکر جن کو ذوی الفروض سے بچا ہوا حصہ ملتا ہے ان کے اوپر بڑا ظلم کیا ہے۔ کیونکہ اس اصول کے مطابق بعض اوقات اخیافی حصہ پا جاتے ہیں اور حقیقی محروم رہ جاتے ہیں۔ مثلاً

مسئلہ ۶

زینب

شوہر	ماں	دو مادری بھائی	دو حقیقی بھائی
۳	۱	۲	محروم

دنیا میں کس کی عقل یہ جائز رکھے گی کہ ترکہ وہ لوگ پا جائیں جو ممکن ہے کہ مورث کے کنبہ کے بھی نہ ہوں اور ماں کسی دوسری جگہ سے ان کو لائی ہو۔ اور وہ لوگ جو باپ کی اولاد اور حقیقی بھائی ہیں محروم رہ جائیں۔ حالانکہ وہ بھی تو ماں کے ذریعہ سے رشتہ رکھتے ہیں۔ اور باپ کے رشتہ سے کچھ اور بھی زیادہ قریب ہو گئے ہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ اس آیت میں بھائی اور بہن کا حصہ قطعاً بیان ہی نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ عہدی رشتہ داروں کا ہے۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ بھائی اور بہن کا ذکر آیت میں صرف اس وجہ سے کیا گیا کہ یہ والدین اور اولاد کی طرح عہدی رشتہ داروں کو محروم نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی موجودگی میں بھی وہ وارث ہو سکتے ہیں

الغرض مادری بھائی اور بہن کا نہ حصہ اس آیت میں بیان کیا گیا ہے نہ وہ ذوی الفروض ہیں بلکہ ان کی حیثیت وہی ہے جو سارے بھائی بہنوں کی ہے اور وہ اس وقت وارث ہوں گے جبکہ نبی اخیافی اور نبی علات میں سے کوئی نہ ہوگا۔

چوتھی آیت

يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ إِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَّلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَهُوَ يَرِثُهَا إِن لَّمْ يَكُن لَّهَا وَلَدٌ فَإِن كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ وَإِن كَانُوا إِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ أَن تَضِلُّوا وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۴/۱۷۶)

لوگ تجھ سے فتوے پوچھتے ہیں۔ کہہ دے کہ اللہ تم کو کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے کہ اگر کوئی مرد مر جائے اور اس کے کوئی اولاد نہ ہو اور ایک بہن ہو تو اس بہن کو نصف ترکہ ملے گا اور بھائی بہن کا وارث ہوگا اور اگر بہن کے کوئی اولاد نہ ہو۔ اگر دو بہنیں ہوں تو ان کو دو ثلث ترکہ ملے گا۔ اور جو ملے جلے بھائی بہن ہوں تو مذکر کو مؤنث کا دگنا ملیگا۔ اللہ صاف صاف بیان کرتا ہے کہ تم غلطی میں نہ پڑو۔ اور اللہ ہر شے کو جانتا ہے۔

یہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ پہلی آیت ورثہ نسبی کی وراثت کے بارے میں ہے یعنی والدین اور اولاد۔ اور دوسری آیت میں ورثہ نسبی یعنی حصہ بتایا گیا ہے یعنی زوجین اور صاحبان عہد کا۔ اب صرف نسبی ورثہ میں سے اطراف باقی رہ جاتے ہیں یعنی بھائی بہن۔ چچا اور پھوپھی وغیرہ۔ اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے انہی کے بارے میں فتویٰ دیا ہے۔ اور ان کا حصہ بعینہ وہی رکھا ہے جو

اولاد کا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اولاد کی عدم موجودگی میں اطراف ان کے "قائمقام ہیں۔ آیت میں ولد کی دو بارہ نفی کی ہے۔ جس سے اس بات کی تاکید مقصود ہے کہ بھائی بہن اسی حالت میں حصہ پائیں گے جبکہ میت کے اولاد مطلقاً نہ ہو۔ اور کلالہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہتے ہی اس کو ہیں جس کے نہ ماں باپ کو چھوڑا ہو نہ اولاد کو۔ لیکن فقہاء نے ایک بھائی بہن کو ماں کے ساتھ بھی وارث بنایا ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ دوسرے قرآن کی اس تاکید کے خلاف وہ اولاد کے ساتھ بھی ان کو وارث بناتے ہیں۔ مثلاً

مسئلہ ۲

زید

بیٹی — بہن حقیقی

۱ — ۱

بلکہ بعض اوقات جب بیٹیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے تو بہن ان سے بھی زیادہ حصہ پاتی ہے۔

مسئلہ ۱۵

زید

دس بیٹیاں — ایک بہن

۱۰ — ۵

یہاں بہن نے ہر بیٹی سے پانچ گنا حصہ پایا۔ حالانکہ بیٹی اپنے باپ کے ترکہ کی زیادہ حقدار ہے۔
پھر فقہا بیٹیوں کے ساتھ بہن کو تو وارث بناتے ہیں اور پوتی کو جو خود میت کی اولاد ہے محروم کر دیتے ہیں۔

مسئلہ ۳

زید

دو بیٹیاں — ایک بہن — ایک پوتی

۲ — ۱ — محروم

اس پر دلیل یہ لاتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بہنوں کو بیٹیوں کے ساتھ عصبہ بنا دو۔" اجعلوا الاخوات مع البنات عصبة" لیکن یہ روایت نہ صرف قرآن کے خلاف ہے بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری حدیث کے بھی جو یہی فقہا روایت کرتے ہیں کہ" الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فلاولی رجل ذکر" یعنی ذوی الفرائض کے معینہ حصے ان کو دے دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ قریب مرد کو دے دو۔ اب فرض کیجئے کہ صورت یہ ہو۔

زید

بیٹی — بہن — بھتیجا

بیٹی تو نصف حصہ اپنا لے لے گی۔ اب نصف جو باقی رہا پہلی روایت کے مطابق اس کی وارث بہن قرار پاتی ہے اور دوسری روایت کے مطابق بھتیجا۔ اس لئے پہلی روایت تو قرآن کے خلاف ہونے کی وجہ سے یقیناً غلط ہے۔ اور دوسری اگر صحیح ہو سکتی

ہے تو صرف اس صورت میں کہ وہ کسی جزئی مسئلہ کے متعلق حضورؐ نے فرمائی ہوگی۔ مثلاً

مسئلہ

زید

باپ	ماں	بیٹی	چچا	بھائی
۱	۱	۳	محروم	۱

اس صورت میں ذوی الفروض کو دے دینے کے بعد ایک سدس جو بچا تھا وہ بھائی کو جو قریب ترین مذکر ہے دیدیا گیا اور اگر یہ قانون کل قرار دی جائے تو قرآن کے خلاف پڑے گی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عباس دونوں بیٹی کی موجودگی میں بہن کو وارث نہیں گردانتے تھے۔ عبداللہ بن عباس کہا کرتے تھے کہ

اللہ تعالےٰ نے تو فرمایا کہ جب کوئی آدمی مرجائے اور اس کے کوئی اولاد نہ ہو صرف ایک بہن ہو تو اس بہن کو نصف دو۔ اور تم نے کہا کہ بہن کو ہم نصف دیں گے خواہ میت کے اولاد بھی ہو۔

اور ابن ابی ملیکہ کہا کرتے تھے کہ "وہ بات جو نہ کتاب اللہ ہے نہ رسول اللہؐ کے فیصلوں میں وہ سب میں تم دیکھو گے یعنی بیٹی کے ساتھ بہن کی توریث"

حقیقت یہ ہے کہ یہ فقہ فرائض کے مدوّن کرنے والوں کی اتنی بڑی غلطی ہے کہ اس کی کوئی توجیہہ سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ سوائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ انہوں نے قرآن کی آیات میں زیادہ غور و فکر سے کام نہیں لیا۔

طریقۂ تقسیم

میت نے اگر کوئی وصیت کی ہے تو اس کے کفن دفن کے بعد اس کا نفاذ سب سے پہلے ہوگا۔ اور قرض جیسا کہ آیات میں آپ نے پڑھ لیا ہے وصیت سے بھی مقدم ہے۔ وصیت میں میت نے اگر پورا ترکہ تقسیم کر دیا ہے تو قواعد میراث کی کوئی ضرورت ہی نہیں پیش آئے گی۔ لیکن اگر اس نے وصیت نہیں کی ہے تو پھر اس کا ترکہ قانونِ وراثت کے مطابق اس کے ورثہ میں تقسیم کیا جائیگا۔ تقسیم ترکہ کے وقت کنبہ کے لوگ۔ رشتہ دار یتیم اور مسکین وغیرہ جو جمع ہونگے ان کو اسی میں سے کھلا یا پلا یا جائے گا۔

وارثین جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں دو قسم کے ہوتے ہیں نسبی اور سببی۔ نسبی وہ ہیں جن کا رشتہ بذریعہ نسب کے ہوتا ہے اور ان کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) اصول۔ یعنی باپ۔ ماں۔ دادا۔ دادی۔ نانا۔ نانی۔

(۲) فروع۔ یعنی اولاد۔ اور اولاد کی اولاد۔

(۳) اطراف۔ یعنی باپ دادا کی اولاد مثلاً بھائی۔ بہن۔ چچا۔ پھوپھی۔ وغیرہ

اور سببی وہ رشتہ دار ہیں جن کا تعلق عقد یا عہد کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ مثلاً میاں بیوی کا ان کا رشتہ عقد سے ہوتا ہے۔ اور اہلِ عہد جن کے ساتھ باہمی وراثت کا بیان کر لیا جائے۔

تقسیم کی ترتیب یہ ہوگی کہ پہلے میاں یا بیوی کو حصہ دیا جائے گا۔ اس کے بعد جو کچھ بچے گا وہ کل ترکہ قرار دیکر نسبی رشتہ داروں میں بانٹا جائے گا۔ اور عہدی تو صرف اس صورت میں ترکہ پاتے ہیں جبکہ اصول و فروع میں سے کوئی موجود نہ ہو۔

یہ ترتیب ملحوظ رکھنے کی وجہ سے یعنی دونوں تقسیموں کو ایک کر دینے کے باعث فقہاء کو تقسیم وراثت میں ایک ایسی حسابی مشکل سے دوچار ہونا پڑا جس کو وہ آج تک حل نہیں کر سکے۔ یہ عول ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جب مخرج ورثہ کے معین حصّوں سے کم پڑ جاتا ہے تو اس کو ان حصوں کی تعداد تک بڑھا لیتے ہیں جس کی وجہ سے قرآن کی مخالفت ہو جاتی ہے۔ مثلاً

مسئلہ ۶ عول ۱۰

زینب

شوہر	ماں	دو حقیقی بہنیں	دو اخیافی بہنیں
۳	۱	۴	۲

یہاں شوہر کو دس سہام میں سے تین ملے یعنی ترکہ کے ایک ثلث سے بھی کم۔ حالانکہ قرآن کی رُو سے اس کا حصّہ نصف ہے۔ اور ماں کو ۱/۱۰ ملا جس کا حصّہ قرآن میں ایک سدس ہے۔ اس طرح حصے اگرچہ برابر رسدی سے پورے کر دیئے گئے مگر ہوگئی قرآن کی مخالفت جس کا سبب یہی ہے کہ فقہاء نے دو الگ الگ تقسیموں کو ملا کر ایک کر دیا ہے۔

اللہ تعالےٰ نے قرآن میں دو قسم کے حصے بیان کئے ہیں۔ پہلے نسبی رشتہ داروں کے حصے ہیں جو دو ثلث۔ ایک ثلث اور ایک سدس ہیں۔ دوسرے سببی قرابت مندوں کے یعنی میاں بیوی کے جو نصف۔ ربع اور ایک ثمن ہیں۔ پہلے حصے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فریضہ ہیں۔ اور دوسرے حصّے وصیت جیسا کہ دونوں آیتوں میں "فریضۃ من اللہ" اور "وصیۃ من اللہ" کے جملوں سے تصریح کر دی گئی ہے۔ اور وصیت فریضہ پر مقدم ہے۔ اس لئے یہاں میاں یا بیوی کو حصے دے کر بقیہ کو پورا ترکہ سمجھا جائے گا اور اس میں سے نسبی رشتہ داروں کو ان کے حصّے دیئے جائیں گے۔ کیونکہ میاں یا بیوی کی وراثت ایک قسم کے احسان اور حسنِ سلوک کا درجہ رکھتی ہے جو پہلے ادا کر دی جائے گی۔ ان حصص کی مختلف نوعیتوں سے ہی یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ دو مختلف تقسیمیں ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس عول کے سخت مخالف تھے۔ اور اس کے قائلین سے کہا کرتے تھے کہ "آؤ جمع ہو کر ہم مباہلہ کریں کہ جھوٹے پر اللہ کی لعنت ہو۔ کیا جس اللہ نے بالو (ریت) کا شمار کر رکھا ہے وہ ایک ہی مال کی تقسیم میں نصف۔ نصف اور ثلث رکھے گا یا تو دو نصف ہی ہوں گے یا تین ثلث۔"

حقیقت یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ اس سے بہت بالاتر ہے کہ اس کے بتائے ہوئے حصّوں میں حساب کی غلطی ہو۔ یہ دراصل فقہ کی غلطی ہے۔ اسی طرح تقسیم وراثت میں فقہ کی دوسری غلطی یہ ہے کہ وہ ترکہ کو علی الرؤس تقسیم کرتی ہے۔ مثلاً ایک شخص مر گیا، اس نے تین پوتے چھوڑے۔ جن میں سے ایک پوتا ایک بیٹے سے ہے اور دوسرے دو ایک بیٹے سے۔ اس صورت میں فقہاء دادا کے ترکہ کو تینوں پوتوں میں برابر حصّوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔

یہ غلطی قائمقامی کے اصولوں کو چھوڑ دینے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ جو دو پوتے ایک بیٹے سے ہیں وہ اپنے باپ کے قائمقام ہیں جو نصف کا حصّہ دار ہو سکتا تھا۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کے دو بیٹے دو ثلث کے حقدار ہو جائیں وہ تو اپنے باپ کی قائمقامی کریں گے اور نصف پائیں گے جو ان کے باپ کا حصہ تھا۔ اور بقیہ نصف کا حقدار وہ پوتا ہوتا ہے جو اپنے باپ کا اکیلا بیٹا ہے۔

ہم پہلے بھی یہ تصریح کر چکے ہیں کہ وراثت کا پورا دائرہ قائمقامی کے محور ہی پر گردش کرتا ہے۔ اس کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(—o—)

محمد اسلام (نمائندہ بزم طلوعِ اسلام، کراچی)

مسئلہ تعلیم کی اہمیّت

(طلوعِ اسلام کی داستانِ جہاد)

طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت (بابت نومبر ۱۹۷۶ء) میں قرآنی درس گاہ کے سلسلہ میں جو اپیل شائع ہوئی ہے، ملک کے اہلِ فکر و بصیرت نے اس سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور اپنے تعاون کا یقین دلایا ہے۔ جو احباب طلوعِ اسلام کی پیش کردہ قرآنی فکر سے متمسک چلے آرہے ہیں، وہ اس اسکیم کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں لیکن جو اس سے واقف نہیں ان کی طرف سے استفسارات موصول ہوئے ہیں جن میں مختصراً پوچھا یہ گیا ہے کہ (۱) کیا طلوعِ اسلام نے اس سے پہلے قوم کے سامنے اس اہم مسئلہ کو پیش کیا تھا، اور (۲) جس نہج کی تعلیم اس کے پیشِ نظر ہے اس کی تفصیل کیا ہے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سوالات برمحل اور اہم ہیں اور ان کا تفصیلی جواب ضروری ہے۔ یوں تو طلوعِ اسلام میں اس موضوع پر جستہ جستہ اکثر و بیشتر لکھا جاتا رہا ہے لیکن اس کی کنونشن (منعقدہ ۱۹۶۳ء) کی ایک پوری نشست اس مسئلہ کے لئے مخصوص کر دی گئی تھی۔ اس میں بزم طلوعِ اسلام کراچی کے نمائندہ محترم محمد اسلام نے اپنے ایک خطاب میں اس تفصیل کو بڑی جامعیت اور حسن و خوبی کے ساتھ سمٹایا تھا۔ اس میں مندرجہ بالا ہر دو سوالات کا جواب آگیا ہے اس لئے اسے پیشِ خدمتِ قارئین کیا جاتا ہے۔ اس خطاب کی اہمیت اس کے مطالعہ سے واضح ہوگی۔ طلوعِ اسلام۔

☆

خطاب

طلوعِ اسلام کی حالیہ کنونشن کے پروگرام میں ایک نشست کو مسئلہ تعلیم کے لئے مخصوص دیکھ کر ایک صاحب نے فرمایا۔ غنیمت ہے کہ طلوعِ اسلام کو قوم کے اس بنیادی مسئلہ کی اہمیت کا احساس ہوا ـــــ یہ صاحب طلوعِ اسلام کی داستانِ حیات سے واقف نہیں تھے اس لئے انہوں نے ایسا خیال کیا۔ اگر وہ اس سے واقف ہوتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ طلوعِ اسلام کی ساری زندگی اسی احساس کی تڑپتی ہوئی تفسیر ہے۔ اس سے مجھے خیال پیدا ہوا کہ ہو سکتا ہے کہ ان کی طرح اور احباب بھی ایسے ہوں جو طلوعِ اسلام کی تگ و تاز کے اس گوشے سے ناواقف ہوں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کنونشن میں اس گوشے کو بھی ذرا تفصیل کے ساتھ سامنے لایا جائے اور بتایا جائے کہ اس کی زندگی کا کوئی سانس ایسا نہیں

گزرا جس میں اس نے اس بنیادی مسئلہ کی اہمیت کو اجاگر نہ کیا ہو۔ بلکہ میں تو یہ کہنے کی بھی جرأت کروں گا کہ پاکستان میں کوئی ادارہ ایسا نہیں جس نے تعلیم کے مسئلہ کی اہمیت کو اس تسلسل و تواتر اور شد و مد سے قوم کے سامنے پیش کیا ہو۔ میں طلوعِ اسلام کے اس جہادِ مسلسل کی داستان کو خود مرتب کرنا چاہتا تھا لیکن میرے سامنے مجلہ طلوعِ اسلام کی ستمبر ۱۹۶۰ء کی اشاعت کے لمعات آ گئے جس میں اس نے خود اس داستان کی مختلف کڑیاں مرتب طور پر پیش کی ہیں۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اسی کی بیان کردہ داستان کو سامعین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔

طلوعِ اسلام کی زندگی کا پاکستانی دور ۱۹۴۸ء سے شروع ہوتا ہے اس اعتبار سے اس داستان میں (جو ۱۹۶۰ء میں پیش کی گئی تھی) اس مسئلہ کے متعلق اس کی تگ و تاز کے پہلے بارہ سال کی سرگزشت سمٹ کر آ گئی ہے۔ غور سے سنیئے کہ اس باب میں طلوعِ اسلام میں کیا کہا گیا تھا۔

"اس دفعہ جوں جوں برسات کا موسم گزرتا جاتا ہے لوگوں کو اطمینان کا سانس آ رہا ہے کہ امسال ملک اس سیلاب سے محفوظ رہے گا جو گزشتہ کئی برسوں سے عالمگیر تباہی کا موجب بنتا چلا آ رہا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملک کا دریاؤں کے سیلاب سے محفوظ رہنا موجب ہزار خیر و برکت ہے لیکن جن لوگوں کو بصارت کے ساتھ بصیرت بھی عطا ہوئی ہے ان کی نگاہیں ایک اور سیلاب کو دیکھ رہی ہیں جو ملک کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور جس کی تباہ کاریاں دریاؤں کے سیلاب سے کہیں زیادہ شدید اور وسیع ہیں ——— دریاؤں کا سیلاب زمین کی سطح پر آتا ہے لیکن یہ دوسرا سیلاب زندگی کی گہرائیوں تک میں اتر جاتا ہے۔ دریاؤں کا سیلاب بارش کے پانی سے اُمنڈ آتا ہے لیکن اس دوسرے سیلاب کے چشمے انسانی قلوب سے ابھرتے ہیں۔ دریاؤں کا سیلاب موجودہ آبادی کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہے، لیکن اس دوسرے سیلاب کی تلاطم خیزیاں آنے والی نسلوں تک کو محیط ہوتی ہیں۔ دریاؤں کا سیلاب زمین کی فصلوں کو بہا کر لے جاتا ہے لیکن یہ دوسرا سیلاب دل کی کھیتیوں کو ویران کر دیتا ہے۔ دریاؤں کے سیلاب سے ایسی وبائیں پھوٹتی ہیں جن سے انسانوں کا جسم ہلاک ہوتا ہے لیکن اس دوسرے سیلاب سے پیدا شدہ جراثیم سے قوم کی رُوح میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ دریاؤں کے سیلاب کا اثر ایک آدھ موسم تک رہتا ہے لیکن اس دوسرے سیلاب کا اثر نسلوں تک مسلسل آگے بڑھتا رہتا ہے۔ دریاؤں کے سیلاب میں افراد ڈوبتے ہیں، اس دوسرے سیلاب میں قوم کی قوم ڈوب کر تباہ ہو جاتی ہے۔"

آپ حیران ہوں گے کہ یہ دوسرا سیلاب کون سا ہے جس کی تباہ کاریاں اس قدر شدید، وسیع اور گہری ہیں؟ یہ سیلاب ہے قوم کے نوجوانوں کی آوارگی، جس کی لپیٹ میں اس وقت ہمارا ملک بُری طرح آ چکا ہے۔ چاروں طرف سے چیخ و پکار ہو رہی ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کا اخلاق تباہ ہو چکا ہے۔ ان کی حرکات آوارگی کی حد سے آگے بڑھ کر جرائم پیشگی تک پہنچ چکی ہیں۔ ان کے ہاتھوں شریف انسانوں کا جینا حرام ہو رہا ہے۔ شریف زادیاں ان کے ڈر سے گھروں سے باہر نہیں نکل سکتیں۔ خود ان کے ماں باپ ان کے ہاتھوں نالاں ہیں۔ معاشرہ ان کی حرکات سے لرزاں و ترساں ہے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سیلاب بلا کا علاج کیا کیا جائے؟

اس میں شبہ نہیں کہ (بدقسمتی) سے ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا بیشتر طبقہ اسی آوارگی کا مظہر ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے لیکن یہ آوارگی ایک دن کی پیدا کردہ نہیں۔ یہ آگ مدتوں سے سلگ رہی تھی، اب بھڑک اٹھی ہے اس کے خلاف قوم کے اربابِ حل و عقد اور اصحابِ فکر و نظر کا احتجاج بھی حق بجانب ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ان نوجوانوں کی

اس آوارگیٔ قلب ونگاہ کا ذمہ دار کون ہے؟ اگر آپ بنظرِ عمیق دیکھیں گے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ اس فسادِ قلب ونظر کی ساری ذمہ داری انہی بڑے بوڑھوں کے سر پہ عائد ہوتی ہے جو اس کے خلاف اس شدت سے واویلا کر رہے ہیں۔ قوم کے بچے گِل کوزہ گراں (کمہار کی مٹی) ہوتی ہے جسے جس شکل میں چاہے متشکل کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ خام مواد (RAW MATERIAL) ہوتا ہے جس سے آپ جو جی میں آئے بنالیں۔ یہ وہ پگھلنے والی دھات ہے جسے جس قالب میں چاہے ڈھالا جا سکتا ہے۔ ہمارے نوجوان جو کچھ بن کر سامنے آرہے ہیں، یہ از خود ایسے نہیں بن گئے یہ ہمارے بنائے ہوئے ایسے بنے ہیں۔ ان کی اس آوارگی کے ذمہ دار ہم خود ہیں جنہوں نے نہ ان کی صحیح تعلیم کا کوئی بندوبست کیا، نہ تربیت کا۔ یہ وہ خطرہ تھا جسے ہم نے تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد محسوس کیا تھا اور قوم کے ذمہ دار حضرات سے کہا تھا کہ سب سے مقدم کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کی صحیح تعلیم کا انتظام کریں۔ آپ جون ۱۹۴۹ء کے لمعات سامنے لائیے ہم نے قوم کے "ذہنی انتشار اور فکری آوارگی" کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد لکھا تھا۔

"قوم کی تعمیر کے دو گوشے ہوتے ہیں۔ ایک موجودہ نسل کی صلاحیتوں کی بیداری اور دوسرے آنے والی نسل کی صحیح تربیت ہو سکتا ہے کہ کسی قوم کی موجودہ نسل میں ارتفاع وارتقاء کی صلاحیتیں ہی باقی نہ رہی ہوں۔ اس صورت میں اربابِ فکر ونظر کی پوری توجہات آنے والی نسل پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ تاکہ یہ ابھرنے والے بچے پیکرِ آب وگِل کے بجائے زندگی کے جیتے جاگتے مجسمے بن کر سامنے آئیں۔ صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰؑ نے جب بنی اسرائیل کو فرعون کے دستِ استبداد سے نجات دلائی تو اُن کے سامنے یہی مقصدِ جلیل تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ فرعون کی انسانیت کُش حکمتِ عملی نے کس طرح نہ صرف بنی اسرائیل کی نسلِ حاضر کو زندگی کی لذتوں سے بیگانہ بنا رکھا ہے بلکہ وہ ان کی آنے والی نسلوں کو بھی کس بُری طرح سے ذبح کئے جارہا ہے۔ انہوں نے بنی اسرائیل کو محکومی کے چنگل سے نکالا تو اپنی تمام سعی و کاوش آنے والی نسل کی تربیت کے لئے وقف کر دی۔ نتیجہ یہ کہ جب وہ "سن شعور کو پہنچے" جوان ہوئے تو انہوں نے نظامِ کہن کی سر فرسودہ بساط کو الٹ کر رکھ دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ محکومی اور آزادی میں فرق ہی یہ ہوتا ہے کہ آزادی میں ہم اپنی آنے والی نسلوں کی تربیت اپنے تصورات کے مطابق کر سکتے ہیں اور یہ چیز محکومی میں ممکن نہیں ہوتی۔ ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس دو سال کے عرصۂ آزادی میں ہم نے اپنے بچوں کی تعلیم میں کیا تبدیلیاں پیدا کی ہیں جس سے ان کا دل و دماغ ان سانچوں میں ڈھل جائے جو ہمارے تصورِ حیات کا آئینہ ہیں (واضح رہے کہ طلوعِ اسلام نے یہ لمعات ۱۹۴۹ء میں لکھے تھے اس لئے کہا گیا ہے کہ دیکھنا چاہیئے کہ ہم نے اس دو سال کے عرصہ میں اس باب میں کیا کیا ہے) جہاں تک ہم دیکھ رہے ہیں اس سوال کا جواب نہایت مایوس کُن ہے۔ ہم بالکل نہیں سمجھ سکتے کہ اس کوتاہی کے لئے کوئی بھی وجۂ جواز ہو سکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ کو کارخانے کھولنے کے لئے مشینوں کی ضرورت ہے جو ممالکِ غیر سے منگانی پڑیں گی۔ اس لئے یہ احتیاج ہماری صنعت وحرفت کی راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔ ہمیں اسلحہ وآلاتِ عسکریت کے لئے بھی بیرونی امداد کی احتیاج ہے اس لئے ہم اس باب میں بھی معذور ہیں۔ ہمیں فنی (TECHNICAL) شعبوں میں ٹریننگ کے لئے ماہرینِ فنون کی ضرورت ہے جن کی ہمارے ملک میں سر دست کمی ہے۔ اس لئے ہم اس باب میں معذور ہیں۔ لیکن یہ فرمائیے

کہ آپ کی راہ میں اپنے بچوں کے لئے جدید نصابِ تعلیم تیار اور نافذ کرنے کے لئے کون سا سنگِ گراں حائل ہے جس کے سامنے آپ

ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہیں۔"

یہ کہا گیا تھا ۱۹۴۹ء میں۔ اس کے ایک سال بعد طلوعِ اسلام نے اسی حقیقت کو اور وضاحت سے بیان کیا تھا جب لکھا تھا کہ "ہمارے نزدیک اصلاح کی وہی صورت ہے جو قرآن نے داستانِ بنی اسرائیل میں نہایت حسین انداز میں بیان فرمائی — بنی اسرائیل کی وہی حالت ہو چکی تھی جو آج ہماری ہے۔ مدتوں کی غلامی نے ان کے تمام درخشندہ جوہر سلب کر لئے تھے اور افسردگی اور دنائت کی تمام خرابیاں اُن میں پیدا ہو چکی تھیں۔ صاحبِ ضربِ کلیم کے یدِ بیضا کی چمک انہیں فرعون کی غلامی سے نکال کر ایک آزاد خطۂ زمین میں لے آئی تھی۔ لیکن خطۂ زمین کے مل جانے سے ان کی سیرتوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ ایک چھوڑ کر تین پیغمبر ان کے اندر موجود تھے۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ اور طور کی وادیوں میں حضرت شعیبؑ۔ لیکن وہ جہاں تھے وہیں رہے۔ چنانچہ خدا نے حضرت موسیٰؑ سے کہہ دیا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور صرف اتنا انتظام کر لو کہ کوئی بیرونی خطرہ اس سرزمین کی تخریب کا باعث نہ بن جائے۔ اس دوران میں قوم کی نئی نسلوں کو اپنے ہاتھ میں لو۔ اِن کی تربیت اپنے انداز سے کرو۔ چنانچہ ہوا یہ کہ ادھر مرورِ زمانہ سے یہ بوسیدہ ہڈیاں رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئیں اور اتنے میں وہ نوجوان تیار ہو گئے جنہیں خاص انداز سے پروان چڑھایا گیا تھا۔ یہ "شاہین" بچے اُبھرے اور ایک ہی جھپٹ میں اُس ارضِ موعود پر قابض ہو گئے جس میں اُن کے بڑے بوڑھوں کو بڑے بڑے دیو نظر آیا کرتے تھے۔ لہٰذا، پاکستان والوں کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی آنے والی نسل کی صحیح تعلیم کا انتظام کریں کہ تعلیم ہی وہ قالب تیار کرتی ہے جس میں سیرتیں ڈھلا کرتی ہیں۔ آج اس بات پر نہ روئیے کہ موجودہ اوپر کا طبقہ سیرت و صلاحیت کے اعتبار سے کتنا پست ہے۔ نہ ہی اس پر کہ نیچے کا طبقہ ضبط و انضباط کی رُو سے کس قدر خام ہے۔ رونا ہے کس پر کہ قوم کی آنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہیں۔ حکومت کے نظم و نسق کے ہر دوسرے گوشے کی خامیوں کو برداشت کر لیا جا سکتا ہے لیکن آنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت سے متعلق گوشے کی خامیوں کو کسی صورت میں بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ اگر وہ نسل بھی ہماری موجودہ نسل کے نقشِ قدم پر چلتی آئی تو پھر یہ سرزمین ہماری ہزار آرزوؤں کے باوجود کبھی محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ ہم لوگوں سے یہ شکایت بھی سنتے ہیں کہ ہماری حکومت تعلیم کی طرف پوری توجہ نہیں دے رہی۔ لیکن ان کی شکایت کا مطلب صرف اس قدر ہوتا ہے کہ حکومت نے کافی تعداد میں اسکول نہیں کھولے، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اسکولوں میں پڑھائی اچھی نہیں ہوتی۔ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہ یہ نہیں۔ آپ قریہ قریہ میں بھی اسکول کھول دیجئے اور ہر اسکول کا نتیجہ سو فیصد دکھا دیجئے، تو بھی ہمارے نزدیک یہ صحیح تعلیم نہیں کہلا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک خواندگی (LITERACY) اور تعلیم (EDUCATION) میں فرق ہی نہیں کیا جاتا۔ ہمارے ہاں خواندگی ہی کو تعلیم سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم کے لئے خواندگی ضروری ہے لیکن خواندگی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ زندگی ہمیشہ اقدار (VALUES) کے تابع چلتی ہے۔ اقدار ہی اس کا نصب العین متعین کرتی ہیں۔ جس قسم کی اقدار انسان کے سامنے ہوں گی اُسی قسم کی اُس کی زندگی ہوگی۔ اور جس قدر ان اقدار سے کسی کو عشق ہوگا اُسی قدر سعی و کاوش اور جذب و انہماک سے ان

کے حصول اور تحفظ کے لئے انسان سرگرمِ عمل رہے گا۔ تعلیم زندگی کی اقدار متعین کرتی ہے۔ جس قسم کی تعلیم ہوگی اُسی قسم کی اقدار متعین ہو جائیں گی۔ صحیح تعلیم سے مفہوم یہ ہے کہ نوجوانوں کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار لائی جائیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جب فرمایا کہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (کہ وہ انہیں نظامِ زندگی اور محکماتِ حیات کی تعلیم دیتا ہے) تو اس سے مراد نوشت وخواند کی تعلیم نہ تھی بلکہ وہی تعلیم تھی جو انسان کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار متعین کرتی ہے، اور جس کا نتیجہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی بالیدگی (یُزَكِّيهِمْ) ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں آج جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں اُن کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے زندگی کا صحیح اقدار نہیں۔ ہمارے معاشرہ میں زندگی کی سب سے بڑی قدر انفرادی خوشحالی اور حصولِ اقتدار ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم لیڈروں کا گروہ یا جیالوں کا گلہ بن چکے ہیں۔ قرآن کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ وہ زندگی کی صحیح اقدار سامنے لے آتا ہے اور یہی اقدار سیرت کی بنیادیں بن جاتی ہیں۔ چونکہ قرآن وہ اقدار متعین کرتا ہے جس سے انسانیت کی پوری پوری نشوونما ہوتی ہے، اس لئے جب کسی کی سیرت ان اقدار کی بنیادوں پر متشکل ہوتی ہے اس کی نظیر کہیں اور نہیں مل سکتی۔ ظاہر ہے کہ رقبہ اور صنعت وحرفت کے اعتبار سے پاکستان دنیا کے بہت سے خطوں سے پیچھے ہے اور جس رفتار سے دنیا ترقی کر رہی ہے اس کے پیشِ نظر ہم مغربی اقوام کے ہم پلہ کبھی نہیں ہو سکیں گے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بلکہ اس سے آگے نکل جانے کے لئے ہمارے پاس ایک دوسرا میدان ہے اور وہ میدان ہے اُن اقدار کا جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یہ اقدار کسی اور فلسفۂ زندگی میں نہیں مل سکتیں۔ اس لئے جو کیریکٹر ان اقدار کے قالب میں ڈھلے گا، اس کی قوت کا جواب دنیا میں اور کہیں نہیں مل سکے گا۔ یہ ہے وہ میدان جس میں نہ صرف یہ کہ ہم اپنی موجودہ خامیوں ہی کو دور کر سکیں گے بلکہ ہم مغرب کی ترقی یافتہ اقوام سے بھی آگے بڑھ جائیں گے۔" (یہ لکھا گیا تھا طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت اگست ۱۹۵۰ء میں۔ اس کے بعد طلوعِ اسلام اپنی اس پکار کو برابر دہراتا رہا) لیکن قوم کو نہ سُننا تھا نہ سُنا۔ اُس کے دسمبر ۱۹۶۵ء میں ملک کے عام حالات کا جائزہ لینے کے بعد لکھا تھا۔

"لیکن اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ قرآنی نظام اپنی حقیقی رُوح کے مطابق اُسی صورت میں نافذ اور نتیجہ خیز ہوگا جب اس کے تقاضے دل کی گہرائیوں سے اُبھریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی آئندہ نسلوں کی تعلیم وتربیت کا ایسا انتظام کریں جس سے ہمارے نوجوانوں کا قلب ودماغ قرآن کے قالب میں ڈھل جائے تاکہ وہ قرآنی نظام کی حکمیت اور اصلحیت کے علیٰ وجہ البصیرت قائل ہوں اور اس کی رُو سے نہ صرف پاکستان بلکہ پوری نوعِ انسانی کی مشکلات کا حل دریافت کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اسی سے ہماری سیرت میں بلندی اور کردار میں پختگی پیدا ہوگی۔"

اس کے بعد اُس نے قوم کی اخلاقی حالت کا ایک منظر پیش کرتے ہوئے کہا:۔

"قوم کے ہنگامی مفاسد کی روک تھام تو ہنگامی احکام وتدابیر سے ہو سکتی ہے، ان کا مستقل علاج اُسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ان کی آنے والی نسل کی تعلیم وتربیت صحیح خطوط پر ہو۔ لہٰذا، ہمارے جدید آئین میں اس امر کی بھی صراحت ہونی چاہئے کہ قوم کے بچوں کی تعلیم وتربیت کی پوری پوری ذمہ داری مملکت پر ہوگی اور اس کے بنیادی خط وخال وہ ہوں گے جنہیں قرآن نے تجویز کیا ہے۔"

اس سلسلہ میں سب سے اہم سوال یہ سامنے آتا ہے کہ جس چیز کو ہم نے "صحیح تعلیم" کہا ہے، اس سے مقصود کیا ہے؟ دسمبر ۱۹۵۸ء میں جب صدر مملکت نے پاکستان میں تعلیمی کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا تو طلوعِ اسلام نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہماری تعلیم کس قسم کی ہونی چاہیئے، لکھا تھا۔

"اوپر کہا جا چکا ہے کہ ہماری تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اُس زندگی کا تصور جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا ہے، صاف اور واضح طور پر ذہن نشین ہو جائے اور اس کی صداقت و حکمیت کا یقین دل میں راسخ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ نہجِ زندگی اور فلسفۂ حیات اُس کے سوا اور کون سا ہو سکتا ہے جسے خدا نے ہمارے لئے متعین کیا ہے۔ اسی کو اسلام یا الدین کہتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اس کے لئے واضح طور پر معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام (یا الدین) کیا ہے؟ اس کے تقاضے کیا ہیں؟ اس کا مقصود و مطلوب کیا ہے؟ وہ کس قسم کے انسان پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ان انسانوں کا نصب العین کیا ہوگا؟ اور ان کی سیرت و کردار کس قسم کا ——— یہ انسان کس قسم کا معاشرہ قائم کریں گے؟ اُس معاشرہ کے نتائج خود اپنی مملکت کے لئے کیا ہوں گے اور باقی عالمِ انسانیت کے لئے کیا (وغیرہ وغیرہ) اسی کا نام "اسلامی تعلیم" ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم نہ تو وہ ہوگی جو اس وقت ——— "اسلامیات" کے نام سے ہمارے اسکولوں میں اور کالجوں میں دی جاتی ہے اور نہ ہی وہ جس کا تحصل ہمارے "علماء" ہوتے ہیں۔ اسکولوں میں جو کچھ دینیات کے نام سے پڑھایا جاتا ہے اس سے بچوں کے ذہن میں دین کے متعلق چند رسومات اور توہم پرستیوں کے سوا، اور کوئی تصور مرتسم نہیں ہوتا۔ باقی رہے ہمارے کالج (بلکہ یونیورسٹیاں) سو ان میں اسلامی تعلیم کا نہج و اسلوب وہی ہے جسے کبھی مغربی مستشرقین نے متعین کیا تھا۔ اس سے (غلط یا صحیح) کچھ معلومات تو ہم پہنچ جاتی ہیں، دین کی رُوح اور اس کی غرض و غایت کبھی سامنے نہیں آتی۔

اب رہے ہمارے مذہبی مدارس ——— سو وہاں کے فارغ التحصیل علماء حضرات کو اسلام کے متعلق کتنی واقفیت ہوتی ہے اس کا کچھ اندازہ آپ نے "منیر کمیٹی" کی تحقیقات کے دوران لگا لیا تھا۔ جب متعدد علماء سے پوچھا گیا تھا کہ "مسلمان کسے کہتے ہیں" تو ان میں سے بعض نے تو کہہ دیا کہ اس کا جواب فی الفور نہیں دیا جا سکتا۔ اور جنہوں نے جواب دیا تھا وہ اس کمیٹی کی رپورٹ کے اندر آج بھی موجود ہے۔ جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ اس سلسلہ میں اگر مزید تجربہ کرنا ہو تو ان حضرات کی خدمت میں ایک سوالنامہ بھیج کر پوچھا جا سکتا ہے کہ "اسلام کسے کہتے ہیں" اور اس کی غرض و غایت کیا ہے"۔ جوابات خود بتا دیں گے کہ ہمارے ان مکاتیب اور دارالعلوموں میں اسلام کے متعلق کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ان مدارس کی غایت یہ ہے کہ طالب علموں کو فقہ کے کچھ مسائل بتا دیئے جائیں (وہ بھی بالخصوص ایسے جن کا تعلق شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) سے ہو) اور کچھ کتابیں وعظ و تصیحت کی پڑھا دی جائیں تاکہ وہ امامت کے فرائض ادا کر سکنے کے قابل ہو جائیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ امامت کے فرائض سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ نماز پنجگانہ یا نمازِ جنازہ پڑھا دی جائے۔ جمعہ یا عیدین کا خطبہ دے دیا جائے یا نکاح پڑھا دیا جائے۔ جو علماء اس سے بلند درجہ پر ہوں وہ نکاح و طلاق وغیرہ کے متعلق فتویٰ دے سکیں۔ یا (جو تقریر کرنا جانتے ہوں وہ) دوسرے فرقہ کے علماء سے مناظرہ کر سکیں۔ باقی رہا "نفسِ اسلام" تو وہ (ان کی مروجہ تعلیم کی رُو سے) ان حضرات کے سامنے آ نہیں سکتا۔ اس لئے کہ (جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے)

حقیقی اسلام پر غیر اسلامی تصورات و نظریات، معتقدات و خیالات کے اس قدر دبیز پردے پڑ چکے ہیں کہ ان کی موجودگی میں حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ نہیں سکتی۔ اور ان پردوں کو الگ کر دینا ان حضرات کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے انہی پردوں کو اصل اسلام سمجھ رکھا ہے۔ یہ بعینہٖ وہ حالات تھے جن سے تنگ آ کر یورپ نے مذہب کو کلیسا کی چار دیواری تک محدود کر دیا اور دنیا کے معاملات اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق حل کرنے لگ گئے۔ جہاں تک مسئلہ زیرِ نظر (یعنی تعلیم) کا تعلق ہے یہی حالت ہمارے ہاں بھی ہے۔ یہاں "دینی تعلیم" مذہبی مکاتب میں دی جاتی ہے اور "دنیاوی تعلیم" اسکولوں اور کالجوں میں۔ اس باب میں ہم میں اور اہلِ مغرب میں فرق یہ ہے کہ اس عملی ثنویت (DUALISM) کے باوجود ہم ہر منبر اور اسٹیج سے پکارتے رہتے ہیں کہ اسلام میں مذہب اور سیاست، روح اور مادہ، دین اور دُنیا میں کوئی مغائرت نہیں۔ اس قسم کی ثنویت یکسر غیر اسلامی ہے۔

لہٰذا ہمارے ہاں تعلیم کے سلسلے میں سب سے پہلا قدم اٹھانے کا یہ ہے کہ "مذہبی اور دنیاوی تعلیم" کی اس ثنویت کو ختم کر دیا جائے۔ جب ہمارے ہاں دین اور دُنیا میں کوئی فرق نہیں تو مذہبی اور دنیاوی تعلیم الگ الگ درس گاہوں میں کیوں دی جائے؟ ہمارے ہاں عصرِ حاضر کے علوم کے ساتھ دین کی تعلیم ایک ہی درس گاہ میں دی جانی چاہیئے۔ اور اس طرح مذہبی پیشوائیت (PRIESTHOOD) کے ادارہ (INSTITUTION) کو ختم کر دینا چاہیئے۔

اس کے بعد طلوعِ اسلام نے بتایا کہ ہماری صحیح تعلیم کی اصل و بنیاد کیا ہونی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں اس نے لکھا تھا۔

"اب رہا یہ کہ دین کی تعلیم کی اصل و بنیاد کیا ہو۔ سو اس کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ دین کی اصل و بنیاد خدا کی کتاب ہے جس پر ہر مسلمان کا ایمان ہے اور جو تمام مسلمانوں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن ہی اس مقصد و منتہیٰ کی وضاحت کرے گا جس کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ یہی بتائے گا کہ مسلمان کا فلسفۂ زندگی کیا ہے اور فریضۂ حیات کیا۔ اسی سے متعین ہوگا کہ ملّتِ اسلامیہ کا اقوامِ عالم میں مقام کیا ہے اور منصب کیا۔ یہی واضح کرے گا کہ مملکتِ پاکستان کا آئین کیسا ہونا چاہیئے اور قوانین کس قسم کے؟ یہی اس کی پالیسی کو معین کرے گا اور اسی سے وہ شاہراہِ حیات پر راہ نمائی حاصل کرے گی۔ اس سے آگے بڑھیئے تو اسی سے وہ کیریکٹر پیدا ہوگا۔ جس کے فقدان کا ہم آج رونا روتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ قرنِ اوّل کے جن مسلمانوں کی سیرت و کردار کو ہم نوعِ انسانی کے لئے بطور معیار اور مثال پیش کرتے ہیں انہیں کس چیز کی تعلیم دی گئی تھی۔ انہیں نبی اکرمؐ نے جو فقید المثال تعلیم دی تھی اسے خود کتاب اللہ نے ان چند الفاظ میں سمٹا دیا ہے۔ کہ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ (۶۲/۲) "وہ قوانینِ خداوندی کو ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان کی ذات کی نشوونما کا سامان فراہم کرتا ہے۔ انہیں کتاب و حکمت (قانونِ خداوندی اور اس کی غایت و مصلحت) کی تعلیم دیتا ہے۔ یہی وہ قرآنی تعلیم تھی جس نے اس اونٹ چرانے والی قوم کو اقوامِ عالم کی امامت (لیڈرشپ) کا اہل اور مستحق بنا دیا۔ قرآن وہ مستقل اقدار دیتا ہے جن کے احترام اور پابندی میں سیرت کی بلندی اور کردار کی پختگی کا راز پوشیدہ ہے۔ یہی مستقل اقدار

وہ حدود ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے ہم اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے قوانین خود وضع کرنے کے مجاز قرار پاتے ہیں۔ انہی کے مطابق وہ معاشرہ متشکل ہوتا ہے جس میں اولاً اس معاشرہ کے افراد کی زندگی اور اس کے بعد پوری نوعِ انسانی کی زندگی جنت کا نمونہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا، ہماری تعلیم کی اصل و اساس قرآن ہے۔ قرآنی تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ اسی کو حق و باطل اور صحیح اور غلط کا معیار قرار دیا جائے۔ ہماری تاریخ ہو یا سیرت، فقہ ہو یا روایات، سب کو قرآن کی روشنی میں پرکھا جائے جو اس کے مطابق ہو اُسے قبول کر لیا جائے۔ جو اس کے خلاف ہو اُسے مسترد کر دیا جائے۔ اس سے وہ غیر اسلامی پردے اٹھ سکیں گے جو ہماری بدقسمتی سے صدیوں سے حقیقی اسلام کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کئے ہوئے ہیں۔ اور جب تک یہ پردے نہیں اٹھیں گے ہم دین کو اس کی اصلی شکل میں کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے آج سے (یعنی ۱۹۳۸ء سے) اکتیس سال پہلے واضح الفاظ میں توجہ دلائی تھی۔ بات یوں ہوئی کہ سر سکندر حیات خان (مرحوم) نے تجویز کیا کہ انہیں کالج براردرہڈ کی طرف سے علامہؒ کی خدمت میں ایک تحسینی سپٹیں کی جائے۔ آپ نے یہ کہہ کر اس تجویز کو مسترد کر دیا کہ "ملت کی ضروریات ایک فرد کی ضروریات سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔" اس کے بجائے (آپ نے کہا کہ) اگر تم لوگوں نے کچھ کرنا ہے تو اسلامیہ کالج میں اسلامیات کی ریسرچ کے لئے ایک ادارہ قائم کرو۔ اس سلسلہ میں آپ نے فرمایا:-

"آج وقت کی اہم ضرورت یہ ہے کہ اسلامی فکر اور منہجِ زندگی کا ان کے حقیقی سرچشمہ کی روشنی میں مطالعہ کر کے قوم کو بتایا جائے کہ دین کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے اور کس طرح اس کے اہم تصورات و مباحث کا ان تجربلی تہوں کے بوجھ کے نیچے دب کر گلا گھٹ رہا ہے جو اسلام کے ضمیر پر بُری طرح سے جم چکی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس اغیر اسلامی قشر (CRUST) کو الگ کر دیا جائے تاکہ ہماری نئی نسل کے ضمیر کو آزادانہ فطری نمود کا موقعہ مل سکے۔"

(تقاریر و بیانات علامہ اقبالؒ۔ صفحہ ۲۱)

حکومت کی طرف سے مقرر کردہ تعلیمی کمیشن کے سوالنامہ کے جواب میں طلوعِ اسلام نے کہا تھا۔

"یونیورسٹی میں قرآن مجید کی وسیع اور گہری تعلیم دی جانی چاہیئے۔ طلباء کو بتانا چاہیئے کہ اس ضابطۂ حیات کی رُو سے زندگی کا منتہیٰ کیا ہے اور اس منتہیٰ کے حصول کا طریقہ کیا۔ یعنی ایک ایسے معاشرے کی تشکیل جو تمام نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کا ذمہ دار ہو۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کی اور اسلامی فکر کی تاریخ بھی پڑھانی چاہیئے۔ اس کا مطالعہ علم و بصیرت کی روشنی میں کرانا چاہیئے۔ اور تنقید کا مدار خالصتہً قرآن کو قرار دینا چاہیئے۔ یعنی انہیں بتانا چاہیئے کہ ہماری تاریخ میں جو کچھ قرآن کے مطابق ہے وہ حق و صداقت کے مطابق ہے جو قرآن کے خلاف ہے وہ غلط ہے۔

اسلامیات کی تعلیم اس انداز کی ہونی چاہیئے جس سے گورنمنٹ اسکولوں اور دینی دارالعلوموں کی ثنویت (DUALISM) ختم ہو جائے۔ ایک اسلامی حکومت میں اس امر کا تصور ہی تعجب انگیز ہے کہ دینی تعلیم کے لئے الگ مدارس ہوں اور دنیاوی تعلیم کے جداگانہ اسکول۔ یہ تفریق غیر مسلم حکمرانوں کے دور کی یادگار ہے، جو اب یہاں سے جا چکے ہیں۔

ہمارے بچوں کی تعلیم خواہ وہ عمومی ہو یا فنی (TECHNICAL) اس میں قرآن کریم کے غیر متبدل قوانینِ حیات کی حیثیت بنیادی ہونی چاہیئے۔ وہ اصول جو تکریم و حرمتِ آدمیت، فرد کی ذات کی نشوونما — عالمگیر انسانیت کی ربوبیت وغیرہ کا سبق دیتے ہیں۔

جہاں تک تعلیم کے اخراجات کا تعلق ہے طلوعِ اسلام نے لکھا تھا کہ "تعلیم کی پوری ذمہ داری مملکت کے سر ہونی چاہئے" جب بچوں کی تعلیم مملکت کی ذمہ داری قرار پاتے گی تو انفرادی اخراجات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ مملکت کی ذمہ داری میں ہر بچہ وہ کچھ بن سکے گا جو کچھ بننے کی صلاحیت اس میں ہے۔ کسی کی مضمر صلاحیتیں اخراجات کی کمی یا فقدان کی وجہ سے دبی کی دبی نہیں رہ جائیں گی۔ صلاحیت کی نشوونما اس صورت میں دب کے رہ جاتی ہے جب ہر بچے کے ماں باپ کو اس تعلیم کا کفیل ٹھہرا دیا جائے (اس صورت میں صرف امیروں کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں خواہ وہ دماغی طور پر کتنے ہی نالائق کیوں نہ ہوں اور غریبوں کے بچے اعلیٰ تعلیم کے لئے ترستے رہ جاتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی قابل کیوں نہ ہوں) لیکن جب پوری کی پوری نسل کی تعلیم کی ذمہ دار اسلامی مملکت ہو جائے گی تو پھر ہر بچے کی تعلیم اس آخری منزل تک پہنچ سکے گی جس تک پہنچنے کی اس میں صلاحیت ہوگی ..... جو لوگ دن بھر ملازمت کرتے ہیں وہ عام طور پر اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لئے مزید تعلیم حاصل کرتے ہیں یعنی تعلیم سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اور اپنے متوسلین کی ضروریاتِ زندگی کے حصول (یا روپیہ جمع کرنے) کے لئے زیادہ کما سکیں۔ اس تعلیم کا جذبۂ محرکہ اس کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ اور اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ ان کی ذات کی نشوونما کا خیال اس کا جذبۂ محرکہ قطعاً نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کے لئے تعلیمی مواقع بہم پہنچانے کے لئے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ انہیں اس قدر دیا جائے جس سے ان کی ضروریاتِ زندگی پوری ہو جائیں اور وہ اُن کی خاطر اس طرح پریشان نہ ہونے پھریں۔ باقی رہا ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما، سو اس کے لئے ایسے مواقع بہم پہنچانے چاہئیں جن میں وہ اپنے مضمر جوہروں کا مظاہرہ کر سکیں۔

اس کے بعد طلوعِ اسلام نے لکھا کہ "یہ ہے ہماری تعلیمی عمارت کا سنگِ بنیاد۔ اگر ہم نے فی الواقع ایسا تعلیمی نظام متشکل کرنا ہے جسے صحیح معنوں میں اسلامی کہا جا سکے تو اس کے لئے پہلا قدم یہی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز اس تعلیمی کمیشن کے حدود و تحقیق و سفارشات سے باہر ہے جس کا تقرر حال ہی میں کیا گیا ہے۔ اس کے لئے اس کے دائرۂ تحقیق کی توسیع یا کسی دوسرے کمیشن کے تقرر کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا اور معاملہ موجودہ نظام کے نظم و نسق میں تغیر و تبدل اور اس کے ٹیکنیکل گوشوں میں اصلاح و ترقی تک محدود رکھا گیا تو (جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے) اس سے وہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکیں گے جن کی آرزو کے آئینہ دار صدر مملکت کے وہ بیانات ہیں جن کے اقتباسات شروع میں زینتِ اوراق کئے گئے"۔ (طلوعِ اسلام۔ فروری ۱۹۶۰ء)

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے نوجوانوں کی جس ذہنی آوارگی کے ہاتھوں ہم اس درجہ نالاں ہیں وہ ایک دن کی پیدا شدہ نہیں۔ یہ رفتہ رفتہ اس حد تک پہنچی ہے اور اس کی وجہ تعلیم کے مسئلہ سے ہمارا مجرمانہ تغافل ہے۔ ہمارے یہ موجودہ نوجوان وہی ہیں جو تشکیلِ پاکستان کے وقت آٹھ آٹھ دس دس سال کے بچے تھے۔ یہ ان کی بارہ تیرہ سال کی غلط تعلیم و تربیت کا تدریجی نتیجہ ہے جو اب یوں اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ زہر صرف موجودہ کھیپ تک محدود نہیں۔ جو بچے ان کے پیچھے آ رہے ہیں وہ بھی تو اسی غلط تعلیم کے پروردہ ہیں۔ اس لئے وہ بھی انہی جیسے (بلکہ ان سے بدتر) ہوں گے۔ لہٰذا، یہ کانٹے جن کی طرف سے ہم نے اتنے برسوں تک تغافل برتا ہے معلوم کتنے عرصہ تک ہمارے پاؤں زخمی کرتے رہیں گے۔ ہمیں ان زخموں کی تکلیف کو طوعاً و کرہاً برداشت کرنا ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تو ضروری ہے کہ آئندہ کے لئے ایسا انتظام کیا جائے جس سے یہ صورتِ حالات دوام حاصل نہ کیا جائے۔ اس کا علاج صحیح تعلیم کے سوا کچھ نہیں۔

قوم کے بچوں میں کیریکٹر اسی سے پیدا ہو سکتا ہے۔

اس مقام پر سوال سامنے آتا ہے کہ صحیح تعلیم سے کیریکٹر کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں؟ اس سوال کے تفصیلی جواب کے لئے تو بڑی فرصت درکار ہوگی لیکن اجمالاً اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ کسی بلند اور اعلیٰ اقدار (VALUE) کی خاطر کمتر درجہ کی قدر کو قربان کر دینا کیریکٹر کہلاتا ہے۔ ہمارے ہاں کی مروّجہ (غلط تعلیم) انسانوں کو محض حیوانی (طبیعی) سطح (PHYSICAL LEVEL) کی زندگی بسر کرنا سکھاتی ہے۔ یہ اسے انسانیت کی سطح پر لاتی ہی نہیں اس لئے اس کے سامنے حیوانی سطح سے بلند کوئی قدر نہیں ہوتی۔ قرآن کریم انسان کے سامنے زندگی کی بلند اقدار رکھتا ہے جن کی خاطر انسان حیوانی سطح سے پست اقدار کو قربان کر دیتا ہے۔ اسی کو کیریکٹر کہتے ہیں۔ اب اس سوال کا دوسرا حصہ لیجئے۔ یعنی ہمارے نوجوانوں میں بے راہ روی پیدا کس طرح ہوئی اور صحیح تعلیم اس کا علاج کس طرح کر دے گی؟ اس کے لئے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ افرادِ معاشرہ کو حدود کے اندر رکھنے کے دو طریق ہوتے ہیں۔ ایک کو کنٹرول (CONTROL) کہہ لیجئے اور دوسرے کو ڈسپلن (DISCIPLINE)۔ کنٹرول کے معنی یہ ہیں کہ کسی پر خارج سے پابندیاں عائد کی جائیں اور اُسے ان پابندیوں پر مجبور کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ انسان ان پابندیوں پر اُسی وقت تک عمل پیرا رہتا ہے جب تک وہ ایسا کرنے پر مجبور ہو۔ جونہی جبر کی گرفت کمزور ہوئی پابندیاں ڈھیلی پڑنی شروع ہو گئیں۔ اس کے برعکس ڈسپلن ہے جس میں انسان اپنے آپ پر خود پابندیاں عائد کرتا ہے۔ وہ ان پابندیوں کی ضرورت اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتا ہے۔ ان کی اہمیت ان کے اعماقِ قلب سے ابھرتی ہے۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ انسان پابندیوں کی اہمیت کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھے۔ جو پابندیاں اس طرح عائد کی جائیں یعنی وہ (SELF IMPOSED) ہوں انسان انہیں کبھی نہیں توڑتا۔ آپ اپنے بچوں کو دیکھئے۔ جس بچے کو آپ گھر میں جبراً پڑھنے کے لئے بٹھاتے ہیں اس کی ہر وقت یہی کوشش ہوتی ہے کہ آپ ذرا اِدھر اُدھر ہوں اور وہ کھیلنے کے لئے نکل بھاگے۔ اس کے برعکس جس بچے کو احساس ہو کہ اگر اس نے محنت نہ کی تو وہ امتحان میں فیل ہو جائے گا۔ اسے کام کرنے کے لئے کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ وہ از خود زیادہ سے زیادہ وقت پڑھائی میں صرف کرتا ہے۔ کنٹرول اور ڈسپلن میں یہی فرق ہے۔

غلط نظامِ تعلیم میں بچوں کی تربیت کنٹرول کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ ان سے اخلاقی امور حکماً منوائے جاتے ہیں۔ انہیں ان کی ضرورت اور اہمیت (یعنی غرض و غایت) کا دل سے قائل نہیں کرایا جاتا۔ جب ہمارے کالجوں کی تعلیم نے ان نوجوانوں میں تنقید کا مادہ ابھارا تو ان پابندیوں کی غایت ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس لئے انہوں نے انہیں بے فائدہ جکڑبندیاں خیال کر کے ان رسّیوں کو توڑنا شروع کر دیا۔ اس سے وہ انارکی (ANARCHY) پیدا ہو گئی جس نے ہمارے نوجوانوں کو ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا۔ کسی نے اس کی ضرورت ہی نہ سمجھی کہ ان کی تربیت ڈسپلن کے طریق سے کی جائے جس سے بلند اقدار کی اہمیت ان کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ جب زندگی کی بلند اقدار سامنے نہ رہیں تو انسان حیوانی سطح سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔ یہ وجوہات ہیں ہمارے بچوں کی موجودہ آوارگی کے۔

قرآن کریم کی صحیح تعلیم، زندگی کی بلند اقدار کو اس طرح اجاگر کرتی ہے کہ انسان انہیں علیٰ وجہ البصیرت قبول کرتا

اور دل و دماغ کے پورے اطمینان سے ان پر کاربند ہوتا ہے۔ اس طرح اس کے کردار میں وہ ڈسپلن پیدا ہو جاتا ہے جو کبھی آوارگی (انارکی) پیدا نہیں ہونے دیتا۔ یہی ہے وہ تعلیم جس کی طرف ہم شروع سے توجہ مبذول کراتے چلے آ رہے ہیں اور جس سے بے اعتنائی برتنے کی وجہ سے معاشرہ کی یہ حالت ہو گئی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس قدر تلخ تجربہ کے بعد بھی ہم اصلاحِ حال کے لئے کوئی مؤثر قدم اٹھانے کے لئے تیار ہیں یا نہیں؟ قوم میں تو ہمیں اس کے لئے کوئی آمادگی نظر نہیں آتی۔ اس لئے ہم اپنی اس درخواست کو پھر دہراتے ہیں جسے ہم نے جنوری ۱۹۵۹ء میں ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ

"ہم صدر مملکت کی خدمت میں باادب لیکن بتاکید گزارش کریں گے کہ وہ قوم اور اسلام کی اس بنیادی ضرورت کو اپنی خصوصی توجہات کا مرکز بنائیں اور اس کے لئے ایسے اقدامات کریں جن سے وہ مقاصد حاصل ہو جائیں جن کا اظہار انہوں نے مختلف مواقع پر کیا ہے اور جن میں مملکت کی سربلندی اور اسلام کی سرفرازی کا راز پوشیدہ ہے۔ اگر انہوں نے تعلیم کے مسئلہ کو ان خطوط پر سلجھا دیا تو بلاشک و شبہ جریدۂ عالم پر ان کا دوام ثبت ہو جائے گا اور قرطاسِ زمانہ پر ان کا نام سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا۔"

عزیزانِ گرامی قدر! یہ ہے مختصر سا جو کچھ طلوعِ اسلام نے تشکیلِ پاکستان کے یومِ آغاز سے ۱۹۶۰ء تک اس باب میں کہا اور کیا۔ اس کے بعد بھی اس نے اپنی اس پکار کو برابر جاری رکھا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ قوم یا قوم کے نمائندے، ارباب اقتدار، اس طرف توجہ ہی نہیں دیتے تو اس نے ہار تھک کر یہ سوچا کہ نہ سہی بڑے پیمانے پر ایک محدود پیمانے پر خود ہی کوئی عملی قدم اٹھانا چاہیئے۔ اس کے لئے اس نے ۱۹۶۵ء میں طلوعِ اسلام کالج کی تشکیل کی تجویز سوچی۔ اس کالج کے نمایاں خط و خال کیا ہیں اور اس باب میں اس وقت تک کیا کچھ ہو چکا ہے اسے قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے سیکرٹری صاحب بیان کریں گے کہ وہی اس کے لئے موزوں ہیں۔ میں آپ سے اجازت چاہوں۔ والسلام

اسلام صاحب نے طلوعِ اسلام کے اس جہادِ مسلسل کا آغاز تشکیلِ پاکستان کے وقت سے کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے یہ سلسلہ اپنے دورِ اوّل کے آغاز (۱۹۳۸ء) ہی سے کر دیا تھا۔ اس داستان کے اس حصّے کو اسی کنونشن (منعقدہ ۱۹۷۲ء) میں ان الفاظ میں پیش کیا گیا تھا:۔

"تحریکِ پاکستان کے دوران جب مہاتما گاندھی نے دیکھا کہ دو قومی نظریہ (جو ان کے نزدیک عصرِ حاضر کا سب سے بڑا فتنہ تھا) مسلمانوں کے رگ و پے میں سرایت کئے جا رہا ہے تو انہوں نے اسے فرو کرنے کے لئے ایک اور اسکیم سوچی جو اپنی اثر انگیزی اور نتائج خیزی کے اعتبار سے بڑی خطرناک تھی۔ اس کی اسکیم یہ تھی کہ ملک میں ایک ایسا نظامِ تعلیم عام کیا جائے جس سے مسلمان بچے اپنے دین کی عظمت کی طرف سے بالکل بیگانہ بنا دیئے جائیں اور وہ خالص ہندوستانی (یعنی ہندو) بن کر ابھریں۔ اس مقصد کے لئے گاندھی جی نے ایک مکمل سکیم وضع کی اور اسے ڈاکٹر ذاکر حسین (مرحوم) کی وساطت سے ملک میں پیش کیا گیا ـــــ اسے "وردھا کی تعلیمی اسکیم" کہا جاتا تھا۔ ملک میں اس کا بڑا چرچا ہوا اور ہر طرف سے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ پرویز صاحب کی نگہ حقیقت شناس نے

اس خطرہ کو بھانپا اور اس اسکیم پر ایسی جامع تنقید کی جس نے دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ اُن کی یہ تنقید طلوعِ اسلام کی اگست ۱۹۴۴ء کی اشاعت میں شائع ہوئی اور ملک میں اس قدر مقبول ہوئی کہ چھ زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا اور ہزاروں کی تعداد میں اس کے پمفلٹ تقسیم ہوئے۔ اس سے اس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف یہ کہ مہاتما جی کی وہ اسکیم ہی گاؤخورد ہو گئی بلکہ اس کے نصاب کی جس قدر کتابیں چھپوائی گئی تھیں انہیں ساحلِ بمبئی سے غرقِ سمندر کرنا پڑا۔ پرویز صاحب کی وہ تنقید نہایت پُر از معلومات، حقیقت کشا، بصیرت افروز اور ہندو ذہنیت کی پردہ در تھی۔ اور اس قابل کہ وہ ساری کی ساری پیشِ خدمت سامعین کی جائے لیکن قلتِ وقت کی بناء پر ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے اس کے صرف تمہیدی الفاظ تک اکتفا کیا جاتا تھا ـــــ غور سے سنیئے۔ انہوں نے لکھا تھا۔

"تاریخِ عالم کے زمانہ قدیم پر نگاہ ڈالئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ قوت و سطوت کی مالک قومیں دوسری قوموں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے قتل و غارت گری اور کشت و خون کے کیا کیا طریقے اختیار کرتی تھیں۔ چنگیز و ہلاکو کی خونچکاں داستانیں صفحاتِ تاریخ پر خون کے حروف میں لکھی ملتی ہیں۔ فرعون و نمرود، شداد و ہامان کے جور و استبداد کے واقعات پڑھنے والے کی روح میں کپکپی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ دورِ جہالت تھا، علانیہ سبعیت و بربریت کا زمانہ تھا۔ عصرِ حاضر کا مہذب انسان اس دورِ وحشت کو سخت نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنے زمانہ کو خدا کی برکتوں اور رحمتوں کا زمانہ سمجھتا ہے کہ جس میں قتل و خونریزی کی وہ داستانیں نہیں دہرائی جاتیں۔ جس میں اُسے انسانیت تڑپتی، بلکتی، پھڑکتی نظر آئے، لیکن جو لوگ حقائقِ اشیاء کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں، ان پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ عصرِ حاضر کا مہذب انسان بھی دوسروں کی ہلاکت اور بربادی میں عہدِ جہالت کے وحشی انسان سے کسی حالت میں کم نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ عہدِ جہالت تھا جس میں انسان نے ابھی یہ نہیں سیکھا تھا کہ اپنی ستم کوشیوں اور ظلم رانیوں کو کس طرح اصلاح و بہبود کے خوشنما نقاب اوڑھائے۔ وہ جو کچھ کرتا تھا بتا کر، جتا کر، دکھا کر کرتا تھا۔ لیکن آج انسان عقل و حکمت میں بہت ترقی کر چکا ہے۔ آج اسی طرح کھلم کھلا اپنی ہوسِ خون آشامی کو پورا کرنا حماقت سمجھا جاتا ہے۔ آج سب سے زیادہ مدبر، سب سے زیادہ ہوشیار وہ ہے جو دوسروں کا خون اس انداز سے پی جائے کہ اس کا دھبہ تک کہیں نظر نہ پڑنے۔ وہ دوسروں کی متاعِ حیات کو اس مشفقانہ انداز سے لوٹ لے کہ اُس پر رہزنی و قزاقی ہونے کا شُبہ تک نہ ہو، وہ ناصح و مصلح کے معصوم لباس میں قوم کی قوم کو تباہ کر جائے، در یں حالت کہ لٹنے والوں کو پتہ ہی نہ چلے کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ دورِ جہالت کا وحشی اور ظالم انسان آج تک بدنام چلا آتا ہے کہ اس کے جور و ستم کی ہلاکت آفرینیاں گویا ایک طوفانِ بلاخیز ہیں جو کف بردہاں بڑھتا، اُمنڈتا، بپھرتا چلا آتا ہے کہ جس کی طغیانیوں کو اندھے بھی دیکھتے ہیں اور جس کی شور انگیزیوں کو بہرے بھی سُنتے ہیں۔ لیکن دورِ حاضر کے مہذب انسان کی استہلاک و تخریب کی چالیں ایک پُر سکوت دریا کی مانند ہیں کہ جس کی روانیوں میں نہ شور ہے نہ تموج۔ لیکن سطحِ آب کے نیچے ایسے ایسے خوفناک مگر مچھ چھپے چلے آتے ہیں کہ قوم کی قوم کو تباہ کر دیں۔ لیکن نہ دیکھنے والی آنکھیں دیکھ سکیں اور نہ سُننے والے کان سُن سکیں۔ اس پُر سکوت طریقِ تخریب اور آتش خاموش میں سب سے بڑا حصہ تعلیم کو حاصل

ہے۔ آپ جس قوم کو تباہ و برباد کرنا چاہیں، نہایت خاموشی سے اُس کے طریقِ تعلیم کو بدل دیجئے وہ رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر ہلاکت و بربادی کے عمیق و مہیب غاروں میں کھنچی چلی جائے گی۔ اُسے پتہ اس وقت چلے گا جب وہ سکراتِ موت کی ہچکیاں لے رہی ہوگی۔ حضرت اکبر مرحوم نے اس جانکاہ حقیقت کو کس قدر بلیغ اور اپنے مخصوص انداز میں بیان فرمایا ہے کہ

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

(طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۳۸ء)

اس تمہید کے بعد انہوں نے بتایا کہ ہندوؤں کی سازش، کس قدر گہری ہے جس کی بروئے کار آوری کے لئے اس تعلیمی اسکیم کو وضع کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد انہوں نے اس اسکیم کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔

سو مسئلۂ تعلیم کے متعلق اس داستانِ جہاد کی ابتداء ۱۹۳۸ء سے ہوتی ہے اور آج تک جاری ہے۔ غالب نے کہا تھا کہ

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے

سو جس استواری کا یہ عالم ہو کہ چونتیس پینتیس سال سے یہ مہم اس ثبات و استقامت کے ساتھ جاری ہو، اس کے "اصلِ ایماں" ہونے میں شبہ کیا ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پیرِ جواں ہمت کی عمر اور صحت میں برکت عطا فرمائے۔ کہ وہ اپنی زندگی کے ایسے حسین خوابوں کی تعبیر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں:

ضرورتِ رشتہ

لاہور میں مستقل رہائش رکھنے والے تنہا صاحبِ جائداد، غیر شادی شدہ، کلاس (ون) آفیسر کے لئے ایک ایسی رفیقۂ حیات کی ضرورت ہے جو ماڈرن ذہنیت، اور ملایانہ فرائض کی بہ نسبت، قرآنی تحقیق و عمل کی زیادہ شائق ہو۔ رشتہ، بلا امتیاز ذات و خاندانی حیثیت، اور بغیر جہیز اور دیگر مسرفانہ رسوم، مطلوب ہے۔ تفصیلی کوائف کے ساتھ (جو صیغۂ راز میں رکھے جائیں گے) خط و کتابت کا پتہ۔

پوسٹ بکس نمبر ۱۹۰۵۔ جی۔ پی۔ او۔ لاہور

پیشگی خریداری کی اسکیم کیا ہے؟

آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کر کے اپنا کھاتہ کھلوا لیجئے۔ ہر مطلوبہ کتاب آپ کو محصول ڈاک بغیر بھیج دی جائے گی۔ لیکن یہ رعایت صرف اندرونِ پاکستان کے پیشگی خریداروں کے لئے ہے۔

یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ

(عام فہم الفاظ میں)

پرویز

آج کل یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلہ نے بڑی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ اس موضوع پر طلوعِ اسلام میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن مجھے جو استفسارات موصول ہوئے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ ایسا فنی اور پیچیدہ ہوتا ہے کہ جو لوگ اس فن سے واقف نہیں ان کی سمجھ میں بات نہیں آتی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے اختلافی پہلوؤں کو عام فہم الفاظ میں سمجھایا جائے۔ یہ چند سطور اسی تقاضا کے پیشِ نظر تحریر کی جا رہی ہیں۔

(۲) سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر اس مسئلہ کو قرآن کریم کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس میں نہ کوئی پیچیدگی رہتی ہے نہ ابہام۔ ساری پیچیدگیاں اور الجھنیں فقہی قوانین کی پیدا کردہ ہیں۔ لہٰذا، ان اشکال اور اختلافات کے ذمہ دار ہم خود ہیں نہ کہ خدا کی کتاب۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے درد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

قرآن مجید میں قانونِ وراثت کی پہلی آیت میں کہا گیا ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۔ ۔ (۴/۷)

(والدین اور اقربون، جن میں والدین بھی شامل ہیں، جو کچھ چھوڑ کر فوت ہوں اس کی تقسیم یوں ہوگی)۔ دوسری آیت یہ ہے:

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ...... (۴/۱۱)

اولاد میں ترکہ کی تقسیم کے متعلق یہ حکم ہے۔

ان آیات میں والدین۔ اولاد اور اقربون کے الفاظ تشریح طلب ہیں۔ ہماری زبان میں والدین سے مراد صرف ماں باپ ہوتے ہیں اور اولاد سے مراد بیٹے بیٹیاں۔ لیکن عربی زبان میں والدین میں ماں باپ اور ان سے اوپر تک (دادا، پردادا وغیرہ) سب شامل ہوتے ہیں اور اولاد میں بیٹے بیٹیاں اور ان سے نیچے تک (پوتے پڑپوتے وغیرہ) سب۔ اس حقیقت کو اہلِ فقہ بھی تسلیم کرتے ہیں اس لئے اس کے متعلق کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ اختلاف اقربون کے مفہوم میں ہے۔

قرآن کریم نے والدین کے ساتھ جو اقربون کا اضافہ کیا ہے تو اس میں بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ اسے اس مثال سے سمجھئے:-

مثال ۱

مثال اگلے صفحہ پر دیکھئے

اس میں بکر سے لے کر رشید تک سب زید کی اولاد میں شامل ہیں اور حمید سے لے کر زید تک سب رشید کے والدین میں شامل۔ اس لحاظ سے زید کی وفات

زید
بکر
عمر
حمید
رشید

بہ بکر سے لے کر رشید تک سب اس کے وارث قرار قرار پا جائیں گے اور رشید کی وفات پر حمید سے لے کر زید تک۔ لیکن اس سے بڑی الجھنیں پیدا ہو جاتیں۔ قرآن مجید نے اقرب کا اضافہ کر کے معاملہ صاف کر دیا۔ لیکن جس لفظ نے قرآنی منشاء کو اس قدر واضح کر دیا تھا فقہ نے اسی سے سارے معاملہ کو الجھا دیا۔ اقربون کا عام ترجمہ رشتہ دار" یا قریبی رشتہ دار" کیا جاتا ہے۔ اس ترجمہ یا مفہوم کی رو سے کہا جاتا ہے کہ قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور کا رشتہ دار وارث نہیں ہو سکتا۔ اقربون کے اسی مفہوم کی رو سے یتیم پوتے کو دادا کے ترکہ سے محروم قرار دیا جاتا ہے۔ بات ذیل کی مثال سے واضح ہو جائے گی۔

مثال ۲

اہل فقہ کا کہنا ہے کہ بکر اور عمر زید کے "قریبی رشتہ دار" ہیں۔ اس لئے وہی زید کے ترکہ کے وارث ہوں گے۔ حمید اور رشید "دور کے رشتہ دار" ہیں۔ (بکر اور عمر کی موجودگی میں) وہ زید کے ترکہ کے وارث نہیں ہو سکتے۔ یہاں تک بات ٹھیک ہے کیونکہ، جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا، یہ اقرب کے قرآنی مفہوم کے مطابق ہے۔

اب آگے بڑھیئے۔ زید کی زندگی میں بکر وفات پا جاتا ہے۔ اہل فقہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں عمر جو زید کا قریبی رشتہ دار ہے، وہ اس کل ترکہ کا وارث ہوگا اور حمید جو زید کا دور کا رشتہ دار ہے وہ اس کے ترکہ سے محروم ہو جائے گا۔ یتیم پوتے کی محرومی کی ساری عمارت اس فقہی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔

(۳) اقرب (جمع اقربون) کا مندرجہ بالا مفہوم صحیح نہیں۔ "اقرب" کا لفظی ترجمہ "قریب تر" ہے۔ "رشتہ دار" نہیں۔ رشتے داروں کے لئے قرآن مجید میں ذی القربیٰ وغیرہ الفاظ آئے ہیں۔ "اقرب" کا قرآنی مفہوم سمجھنے کے لئے پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھئے کہ قرآن مجید نے یہ نہیں کہا کہ ترکہ "اقربون" کو ملے گا۔ اس نے کہا ہے کہ جو کچھ اقربون چھوڑ جائیں وہ ان کے ورثاء میں تقسیم ہو۔ یعنی اقرب کا لفظ متوفی کے لئے آیا ہے۔ وارث کے لئے نہیں۔ بظاہر ان دونوں میں کچھ فرق نظر نہیں آتا لیکن آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ ان میں بڑا اہم فرق ہے۔ اقرب کے معنے ہیں وہ متوفی جس کے اور اس کے وارث کے درمیان کوئی اور وارث نہ ہو۔ مثال ۲ کو سامنے لائیے۔ زید، بکر اور عمر دونوں کا اقرب ہے کیونکہ اس کے اور اس کے ان بیٹوں کے درمیان کوئی اور وارث حائل نہیں۔ لیکن وہ حمید اور رشید کا اقرب نہیں کیونکہ اس کے اور ان دونوں کے درمیان بکر اور عمر روک بن کر کھڑے ہیں۔ یعنی زید اور حمید کے درمیان بکر اور زید اور رشید کے درمیان عمر۔ لہٰذا۔ بکر اور عمر کی موجودگی میں وہ حمید اور رشید کا اقرب نہیں ہو سکتا۔ وہ بے شک حمید اور رشید کا "والد" ہے لیکن ان کا اقرب نہیں۔ اس سے مثال ۱ کی حکمت بالغہ واضح ہو جائے گی۔

لیکن اگر زید کی زندگی میں بکر فوت ہو جائے تو وہ حمید کا اقرب ہو جائے گا کیونکہ اب وہ رکاوٹ دور ہو گئی جس کی وجہ سے وہ حمید کا اقرب نہیں تھا۔ البتہ وہ رشید کا اقرب نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے اور رشید کے درمیان عمر کی رکاوٹ

موجود ہے ۔ لہٰذا ، زید کی وفات پر رشید تو اس کے ترکہ سے محروم رہے گا ، حمید نہیں ۔

اب آپ سوچئے کہ جب قرآن مجید نے کہا ہے کہ اقرب جو کچھ چھوڑ کر مریں ان کے ترکہ کی وارث ان کی اولاد ہو گی تو حمید کو ، جو زید کی اولاد بلا رکاوٹ ہے ، زید کی وراثت سے محروم کر دینا قرآن مجید کی کھلی ہوئی مخالفت نہیں تو اور کیا ہے ؟ فقہ کا فیصلہ ہے کہ عمر جس طرح رشید کے راستے میں رکاوٹ ہے اسی طرح حمید (یتیم) کے راستے میں بھی رکاوٹ ہے ۔ سوچئے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ بکر کی زندگی میں زید اور حمید کے راستے میں رکاوٹ بکر تھا ، نہ کہ عمر ۔ تو بکر کے مرنے کے بعد عمر ، حمید کی رکاوٹ کیسے بن گیا ؟ ذیل کی مثال کی دو لائنوں پر غور کیجئے ۔

مثال نمبر ۳

زید	اور	زید
بکر		عمر
حمید		رشید

یہ دونوں لائنیں الگ الگ ہیں ۔ بکر حمید کی رکاوٹ ہے اور عمر رشید کی ۔ حمید کی رکاوٹ بکر کے مرنے سے دور ہو گی اور رشید کی عمر کے مرنے سے ۔ آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ فقہ بھی اسے تسلیم کرتی ہے کہ زید اور حمید کے راستے میں رکاوٹ بکر ہے ، عمر نہیں ۔ اگر زید اور بکر کی زندگی میں حمید فوت ہو جائے تو اس کا وارث بکر ہوتا ہے ۔ زید نہیں ۔ لیکن اگر بکر ، حمید سے پہلے فوت ہو جائے تو پھر فقہ ، زید کو حمید کا وارث تسلیم کر لیتی ہے خواہ عمر زندہ ہی ہو ، یعنی اس صورت میں عمر ، زید اور حمید کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتا ۔ بالفاظ دیگر ، ہماری فقہ کی رو سے یتیم پوتہ تو دادا کی وراثت سے محروم قرار پا جاتا ہے لیکن دادا اپنے یتیم پوتے کی وراثت سے محروم نہیں قرار پاتا ۔ یہ بات آپ کو عجیب سی لگے گی ۔ لیکن عجیب ہو یا غریب ہے یہ واقعہ ۔ فقہ کا یہی فیصلہ ہے ۔ اس سے واضح ہے کہ فقہ خود تسلیم کرتی ہے کہ اقرب کے معنے "قریبی رشتے" نہیں بلکہ وہ متوفی ہے جس کے اور اس کے وارث کے درمیان کوئی اور وارث نہ ہو ۔

(۴) فقہ کے فیصلے کی رو سے جو الجھنیں پیدا ہوتی ہیں اس کی ایک دلچسپ مثال ملاحظہ فرمائیے ۔ زید اور اس کے دونوں بیٹے (بکر اور عمر) ایک جگہ کھڑے ہیں ۔ کچھ ڈاکو زید پر حملہ کرتے ہیں ۔ عمر اپنے باپ کو چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے ۔ بکر اُسے بچانے کے لئے ڈاکوؤں کا مقابلہ کرتا ہے ۔ گولی اسے بھی لگتی ہے اور زید کو بھی ۔ بکر وہیں موقع پر مر جاتا ہے اور زید ہسپتال میں جا کر کچھ وقت بعد دم توڑ دیتا ہے ۔ فقہ کے فیصلے کی رو سے بکر کی یتیم اولاد زید کے ترکہ سے محروم رہ جائے گی اور عمر جو باپ کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا ۔ باپ کے سارے ترکہ کا وارث بن جائے گا ۔

جب زید اور بکر کو گولی لگی تھی ، اگر زید پہلے مر جاتا اور اس کے دو منٹ بعد بکر فوت ہو جاتا تو حمید کو زید کے ترکہ سے حصہ مل جاتا ۔ لیکن اگر بکر زید سے دو منٹ پہلے مر جائے تو پھر حمید کو کچھ نہیں مل سکتا ۔

(۵) اہل فقہ کی طرف سے یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ پوتا اپنے باپ کے ترکہ کا وارث ہوتا ہے ۔ جب بکر کو ، اپنے باپ سے پہلے مر جانے پر باپ کے ترکہ سے کچھ ملا ہی نہیں تو حمید کون سے ترکہ کا وارث ہو جائے گا ؟ ان سے پوچھئے کہ اگر دلیل یہی ہے تو ۔۔ اگر بکر اور عمر زید سے پہلے مر جائیں تو زید کے مرنے پر حمید اور رشید کو اس کے ترکے کا وارث کیسے بنایا جا سکتا ہے کیونکہ انہوں نے تو اپنے باپوں کا ترکہ لینا تھا ۔ جب ان کے باپوں نے زید کا کوئی ترکہ ہی نہیں پایا تھا تو ان کے بیٹوں کو زید کا ترکہ کیسے مل جائے گا ؟ لیکن فقہ خود اپنی دلیل کے خلاف انہیں یہ ترکہ دیتی ہے ۔ اصل یہ ہے کہ حمید ، اپنے باپ کے مرنے پر ، باپ کی جگہ آجاتا ہے ، اسی طرح رشید ، اپنے باپ کے مرنے پر اس

کی جگہ۔ اس وقت یہ زید کے "پوتے" نہیں رہتے۔ "اولاد" میں شامل ہونے کی جہت سے، اس کے "بیٹے" بن جاتے ہیں۔ یعنی زید کے بیٹوں کے قائم مقام ہو جاتے ہیں۔ یتیم پوتہ اپنے مرحوم باپ کا قائم مقام ہوتا ہے۔

☆

مجھ سے یہ بھی پوچھا گیا ہے کہ یہ حضرات اپنے موقف کی تائید میں کون سی سند پیش کرتے ہیں۔ یہ بھی سن لیجئے۔ یتیم پوتے کو دادا کی وراثت سے محروم قرار دینے میں مودودی (مرحوم) پیش پیش تھے۔ ان سے جب پوچھا گیا کہ اس کے لئے سند کیا ہے تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا:۔

فقہاء اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مر گیا ہو وہ وارث نہیں ہوتا بلکہ وارث اس کے چچا ہوتے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلہ کی بناء قرار دیا جا سکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہاء امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔

(رسائل و مسائل۔ جلد دوم۔ ایڈیشن سوم صفحہ ۲۱۰-۲۰۹)

یعنی انہیں اپنے موقف کی تائید میں نہ قرآن کریم سے کوئی حکم ملا نہ حدیث سے لیکن چونکہ اسلاف سے یہ مسلک متواتر چلا آ رہا ہے اس لئے اتباع اسی کا کرنا چاہیئے۔ یہ وہی دلیل ہے جسے قرآن کریم متعدد مقامات پر یہ کہہ کر پیش کرتا ہے کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (۲/۱۷۰) "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اللہ کی کتاب کا اتباع کرو تو یہ جواب میں کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی مسلک کا اتباع کریں گے جو ہمارے اسلاف سے چلا آ رہا ہے"۔

ما انزل اللہ، کے اتباع کی دعوت طلوعِ اسلام نے دی تھی۔ ان کے متعلق مودودی (مرحوم) نے فرمایا تھا کہ یہ قریب قریب سب کے سب کچھ ایسے ٹیڑھے ذہن کے لوگ ہیں جو ہر دینی مسئلے میں ہمیشہ ایک نرالی اُپج کی بات نکالا کرتے ہیں۔ ان کی بات اگر مانی جائے تو گویا ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اسی ایک مسئلے میں نہیں بلکہ پورے دین کے سمجھنے میں پہلی صدی سے لے کر آج تک ساری اُمت غلطی کرتی رہی ہے اور دین کو اگر سمجھا ہے تو صرف اس دور کے تین چار آدمیوں نے سمجھا ہے اس طرح کے خبطیوں کی بات آخر کس التفات کی مستحق ہو سکتی ہے؟

(ترجمان القرآن بابت جون۔ جولائی ۱۹۵۲ء)

علم اور دین کی بارگاہ سے اس قسم کے جوابات کے متعلق جو کچھ کہا جائے گا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جب ان پر یہ اعتراض کیا گیا کہ جب تک یتیم پوتوں کا دادا زندہ تھا وہ ان کی پرورش کا ذمہ دار تھا کیونکہ اس کی جائداد اس کے اپنے قبضے میں تھی اس کے مرنے کے بعد یہ جائداد یتیموں کے چچا کے پاس چلی جائے گی اور انہیں اس میں سے کچھ بھی نہیں ملے گا تو یہ بے سہارا رہ جائیں گے۔ ان کی پرورش کا کیا انتظام ہوگا۔ تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ

شریعت کی رو سے اس کے چچا اس کے ولی ہوتے ہیں اور ان پر اس کا حق ہے کہ وہ ان یتیموں کی پرورش کا انتظام کریں۔ (رسائل و مسائل۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۱۰)

انہوں نے یہ بھی کہا کہ دادا ان کے حق میں کچھ وصیت بھی کر سکتا ہے۔

یعنی پہلے تو انہیں اس حق سے محروم کر دیا جو انہیں اللہ تعالیٰ نے دیا تھا اور پھر ان کے چچا کو ترغیب دلائی کہ وہ ان بے سہارا یتیموں کی طرف (جن کے حصے کو ہڑپ کر چکے ہیں) بھیک کے کچھ ٹکڑے پھینک دیا کریں۔ (یتیموں کی جس طرح پرورش ہوا کرتی ہے اس کا کسے علم نہیں)۔ اس سے ہمیں یہودیوں کی وہ ذہنیت یاد آگئی جسے قرآن کریم نے ہماری عبرت آموزی کے لئے بیان کیا ہے۔ وہ کرتے یہ تھے کہ اپنے ہاں کے غریب اور بے سہارا لوگوں کو بستیوں سے نکال دیتے اور جب انہیں دوسرے لوگ پکڑ کر قیدی بنا لیتے تو پھر ان قیدیوں کو چھڑانے کے لئے آپس میں چندے اکٹھے کرتے کیونکہ ان کے نزدیک قیدیوں کو رہا کرانا بڑے ثواب کا کام تھا۔ قرآن کریم نے اس پر ان کی سخت سرزنش کی ہے اور کہا ہے کہ اس "ثواب کمانے" کی خاطر تم جو پہلے جرم کرتے ہو تمہیں اس کی سنگینی کا اندازہ نہیں؛ اور کیا تمہارا یہ ازعمِ خویش، ثواب کا کام اس کا کفارہ بن سکتا ہے؟ اس کے بعد کہا کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ "تم کتاب اللہ کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے سے کفر برتتے ہو"؛ یاد رکھو فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵) "اس روش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ ہو نہیں سکتا کہ دنیاوی زندگی میں تم ذلیل و خوار ہو اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں مبتلا۔"

یتیم پوتوں کے سلسلے میں ہم بھی یہی روش اختیار کرتے ہیں۔ پہلے انہیں ان کے حق سے محروم کر دیتے ہیں اور پھر ان کے اپنے رشتے داروں کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ ان یتیموں کی پرورش کر کے ثواب کمائیں۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

محترم پرویز صاحب کا

درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)

M9 SUTTON COURT RD

LONDON E-13 - 9NR لندن (انگلینڈ)

PHONE 01 - 552 - 1517

لاہور میں ہر جمعہ ۹½ بجے صبح (فون ۸۰۰۸۰) ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) دفتر چوہدری شاہنواز صاحب۔ عابد سلک انڈسٹریز عقب اڈہ لاریاں (ماڈل ری جینٹ) (فون ۳۰۸۹۰)

کراچی میں ہر جمعہ کو ۹½ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ کمرہ نمبر ۲۴ ہارون چیمبرز الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی۔ کراچی ۲

گوجرانوالہ میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) رہائش گاہ چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ سول لائنز (بالمقابل پرانا ریلوے اسٹیشن)

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) بمکان آغا محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر۔ بالمقابل وی آئی پی مین گیٹ۔ پشاور سٹیڈیم۔ بارہ روڈ (فون ۲۷۵۹۴)

گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام۔ بمقام ۱۲/۱/بی کھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

بقیہ درسِ قرآن کریم صفحہ ۶۲ پر دیکھئے۔

روس کے بعد چین کی ناکامی

جب ۱۹۱۷ء میں روس میں کمیونسٹ انقلاب رونما ہوا تو اس سے ساری دُنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ ایک طرف وہ طبقہ جو صدیوں سے نظام سرمایہ داری کی چکی میں پستا چلا آ رہا تھا حمد و ستائش کے نغمے بلند کرتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ دوسری طرف نظام سرمایہ داری کے علمبردار اور مذہبی پیشوائیت کے خود ساختہ خدائی نمائندوں نے اس کی مخالفت میں قیامت برپا کر دی۔ اس مخالفت کے باوجود روس آگے ہی آگے بڑھتا گیا اور عام طور پر یہ سمجھا گیا کہ اب انسانیت کا مستقبل اسی کے ہاتھوں میں ہوگا۔ لیکن عین اس زمانے میں یہاں سے ایک آواز بلند ہوئی جو انتہائی حیرت انگیز بھی تھی اور فکر خیز بھی۔ یہ آواز تھی مفکرِ اسلام علامہ اقبالؒ کی جسے فطرت نے حوادثِ کائنات کو شمعِ قرآنی کی روشنی میں پرکھنے کی صلاحیت عطا فرمائی تھی۔ انہوں نے کمیونزم کے پیش کردہ معاشی نظام کی تو تائید کی کیونکہ وہ قرآن کریم کے معاشی نظام کا عکس لئے ہوئے تھا، لیکن دوسری طرف انہوں نے اس فلسفہ کی سخت مخالفت کی جس کی بنیادوں پر مارکس اس نظام کو استوار کرنا چاہتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اس قسم کے عظیم عالمگیر نظام کی بنیاد ابدی اقدار کی بنیادوں پر ہی استوار ہو سکتی ہے لیکن مارکس چونکہ ان اقدار کا قائل نہیں اس لئے کمیونزم کا نظام کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکے گا۔ انہوں نے جاوید نامہ میں روس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ؎

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی — دل ز دستورِ کہن پرداختی
کردہ ئی کارِ خداوندان تمام — بگذر از لا۔ جانبِ الّا خرام
اینکہ می خواہی نظامِ عالمے — جستۂ او را اساسِ محکمے

یہ اساسِ محکم کہاں سے ملے گی؟ کہا

داستانِ کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب

اُس وقت کمیونزم کا غلغلہ اتنا بلند تھا کہ لوگوں نے اسے ایک شاعر کا خواب سمجھا لیکن زیادہ عرصہ گذرنے نہ پایا تھا کہ اس فلک بوس عمارت کی ایک ایک منزل زمین بوس ہونی شروع ہو گئی اور آج وہاں کا نظام، یوں کہئے کہ نظامِ سرمایہ داری کی بگڑی ہوئی شکل سے زیادہ کچھ نہیں۔

روس کے زوال کے کھنڈرات سے چین نے سر اٹھایا اور ماؤزے تنگ کی شخصیت نے اسے اس انداز سے پیش کیا کہ وہ دُنیا کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔ یہ ۱۹۴۹ء کی بات ہے۔ اُس وقت علامہ اقبالؒ تو دنیا میں موجود نہیں تھے لیکن فکرِ قرآنی کی شمع بدستور روشن تھی اور ایک اور مفکرِ قرآن، پرویز صاحب کے ہاتھوں میں ضو فشاں۔ انہوں نے مارکس کے فلسفے کا شرح و بسط سے تجزیہ کیا لیکن اس کے حصۂ لا پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مثبت طور پر قرآن کا معاشی نظام

بھی نہایت وضاحت سے پیش کیا۔ انہوں نے اس موضوع پر بڑی کثرت سے لکھا۔ اس کا ملخص ان کے ایک خطاب کے محض عنوان سے واضح ہو جاتا ہے یعنی "جہاں مارکس ناکام رہ گیا، اس سے آگے"۔

مارکس اور لینن کے ساتھ ساتھ انہوں نے ماؤزے تنگ کے فلسفہ اور نظام کا بھی تجزیہ کیا۔ یہ جامع صورت ان کے اس مبسوط مقالہ میں ملے گا جو "ماؤزے تنگ اور قرآن" کے عنوان سے طلوعِ اسلام بابت جنوری ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا اور اب ان کی کتاب "نظامِ ربوبیت" کے دوسرے ایڈیشن میں شامل ہے۔ اس کے قریب دو سال بعد انہوں نے "انقلابِ محمدی" کے عنوان سے ایک جامع اور فکر انگیز خطاب پیش کیا جو طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت جون ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے کمیونزم کے نظام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

روس نے اپنے اقتصادی پروگرام کے لئے اساسِ محکم کو تلاش اور اختیار نہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے تھوڑے ہی عرصے بعد رجعت اختیار کرنی پڑی اور یوں یہ تحریک وہاں ناکام رہ گئی۔ اب اس کا تجربہ چین میں ہو رہا ہے۔ لیکن چونکہ اساسِ محکم اس کے ہاں بھی نہیں اس لئے وہاں بھی یہ تحریک پروان نہیں چڑھ سکتی۔ علاوہ ازیں، انہوں نے اپنی ساری توجہات کا مرکز ایک شخصیت (ماؤزے تنگ) کو بنا رکھا ہے۔ وہ خدا کے منکر ہیں لیکن ماؤزے تنگ کی پرستش کرتے ہیں۔ اس لئے اس تحریک کی زندگی ماؤزے تنگ کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ شخصیتوں کے ساتھ وابستہ تحریکوں کا انجام ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔

اُس زمانے میں اس قسم کے دعویٰ کی صداقت کو کوئی باور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ چین کے نظام کی کامیابی ایک حقیقت ثابتہ بن کر دُنیا کے ذہنوں پر چھائی ہوئی تھی اور مملکتِ چین کا اقتدار دن بدن بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن ماؤزے تنگ کی وفات کے بعد کیا ہوا؟ اس کا ابھی (محاورے کے الفاظ میں) کفن بھی میلا نہیں ہونے پایا تھا کہ چین میں انتشار ہو گیا اور اس کا پہلا نشانہ خود ماؤزے تنگ کی شخصیت بنی۔ اس کے بعد اس کا فلسفہ اور پھر اس کا نظام۔ ماؤزے تنگ کی "لال کتاب" جو اس کی زندگی میں اس کی قوم کے نزدیک صحیفۂ آسمانی تھی اسے ورق ورق کر دیا گیا۔ ملک کے در و دیوار پر جہاں جہاں اس کے اقوال منقوش یا کندہ تھے اور جن کے سامنے قوم کا ہر چھوٹا بڑا سجدہ ریز نظر آیا کرتا تھا انہیں ایک ایک کر کے مٹا دیا گیا۔ جن شخصیتوں کو اس نے مملکت کا غدار قرار دے کر ملک بدر کر دیا تھا وہ نہ صرف ایک ایک کر کے واپس آ گئے، بلکہ قوم نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھا لیا اور ماؤزے تنگ کے ساتھیوں کے خلاف مقدمات دائر کر دیئے گئے۔ ان میں خود اس کی بیوی بھی شامل ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے امریکہ سے شائع ہونے والے رسالہ نیوز ویک کی ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۹ء کی اشاعت کا پرچہ ہے۔ اس میں انقلابِ چین کی تیسویں سالگرہ (اور ماؤزے تنگ کی تیسری برسی) کی روئداد درج ہے۔ اس میں چین کی کمیونسٹ پارٹی کے دس ہزار نامور نمائندگان نے شمولیت کی۔ ان میں سے ہر ایک نے ماؤزے تنگ کی شخصیت، اس کے فلسفہ، مسلک، اقدامات اور نظام کی شدت سے مخالفت کی اور کہا کہ اس نے اس قوم اور ملک کو تباہی کے کنارے تک پہنچا دیا۔ وہاں کی نوجوان نسل جس نے ماؤزے تنگ کے "سُرخ انقلاب" کو اس جوش و خروش کے ساتھ اپنایا تھا اب اسی شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کر رہی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ پرویز صاحب نے جو کچھ دس بارہ سال پہلے کہا تھا وہ کس طرح حرفاً حرفاً صحیح ثابت ہو رہا ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ بھی علامہ اقبالؒ کی طرح حوادثِ زمانہ کو قرآن کریم کی روشنی میں پرکھتے ہیں اور یہ کتابِ عظیم جس

نتیجے پر پہنچاتی ہے اسے بیباکانہ قوم کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ مناسب نظر آتا ہے کہ انہوں نے ۱۹۶۷ء میں اپنے خطاب "ماؤزے تنگ اور قرآن" کے آخر میں جو کچھ کہا تھا اس کا ایک اقتباس پیش قارئین کر دیا جائے۔ انہوں نے ماؤزے تنگ کے فلسفہ کا تجزیہ کرنے کے بعد لکھا تھا:-

"یہ ہے وہ فلسفہ جس کا اجمالی تعارف ہم نے شروع میں کرایا تھا اور جس کی بنیادوں پر، وہ اتنے عظیم معاشی نظام کی عمارت استوار کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فلسفہ کی بنیادوں پر یہ عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ جب چین میں السابقون الاولون (PIONEERS) کی موجودہ نسل ختم ہو جائے گی تو پھر (آئندہ نسل کے لئے) اتنی بڑی قربانیوں کے لئے کوئی جذبہ محرکہ نہیں رہے گا۔ اور چینی انقلاب بھی اسی تحریف (REVISIONISM) پر مجبور ہو جائے گا جس کا طعنہ وہ اس وقت روس کو دے رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ، پہلے روس اور اس کے بعد چین کی ان انقلابی جماعتوں نے کمانی قانون کی تائید کے لئے ہاتھ اٹھا کر، اس کی رفتار میں تیزی پیدا کر دی ہے۔ لیکن چونکہ ان کے انقلاب کی اساس و بنیاد محکم نہیں، اس لئے یہ انقلاب ایک ہنگامی حادثہ بن کر رہ جائے گا۔ اور اس کے بعد، اگر کمانی قانون نے اپنے حساب سے "ایک دن" کی بھی مزید "تاریخ ڈال دی"، تو انسانیت کو صدیوں تک پھر سرمایہ داری کے آہنی شکنجہ میں جکڑے رہنا پڑے گا۔ لیکن اگر اس وقت، اس معاشی انقلاب کو قرآن کی اساس محکم مل جائے تو پھر نظام سرمایہ داری سر نہیں اٹھا سکے گا اور جنت سے نکلا ہوا آدم، اپنے فردوس گم گشتہ کو پھر سے پالے گا۔ اقبالؒ نے نٹشے کے فکر کی بلندی اور اس کی بنیاد کی پستی کو دیکھ کر کہا تھا کہ ؎

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبالؒ اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے؟

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس "مجذوبِ فرنگی" سے کہیں زیادہ ضرورت آج اس "سالکِ چینی" کو مقامِ کبریا سے آگاہ کرنے کی ہے۔ یہ اس لئے کہ مقامِ کبریا کے راستے میں جو خاردار جھاڑیاں دامنگیر ہوتی ہیں، چین نے انہیں راستے سے الگ کر دیا ہے ـــــ وہاں بادشاہی، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کی قوتیں ختم ہو چکی ہیں۔ اور یہی وہ خاردار جھاڑیاں ہیں جو انسان کو "خدا" تک پہنچنے نہیں دیتیں ـــــ یہ وہ حصۃ لا ہے جسے طے کئے بغیر انسان الا اللہ تک پہنچ نہیں سکتا۔ چین ان منفی منازل کو طے کر لینے کے بعد، دین کی منزلِ الاّ کی سرحد پر کھڑا ہے۔ اگر اس وقت، اسے اس مقام کی نشان دہی کر دی جائے اور وہ اس راستے کو اختیار کرے، تو صرف چین ہی نہیں عالمگیر انسانیت اس جہنم سے بچ سکتی ہے جس میں اسے بصورتِ دیگر، معلوم کتنے عرصہ تک اور مبتلائے مصائب رہنا پڑے اور اس سے نکلنے کے لئے خدا جانے اسے کتنی خون کی ندیاں پیرنی، اور آگ کے دریا عبور کرنے پڑیں ـــــ مسلم ممالک میں سے اس وقت کوئی بھی اس کے لئے آمادہ نظر نہیں آتا کہ وہ قرآن کے انقلابی پروگرام کو اپنے ہاں عملاً متشکل کر دے۔ یہ ممالک ابھی حصۃ لا ہی سے نہیں نکلے، حصۃ الاّ تک کیسے پہنچ سکیں گے۔ پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا، کہ اس سے "اسلام اس بچے کو مٹا سکے گا، جسے عربی ملوکیت نے اس پر ثبت کر دیا تھا" ـــــ لیکن یہاں جس تیزی سے مذہبی پیشوائیت اپنا تسلط جما رہی ہے اس کے پیشِ نظر یہاں دین کے تمکن کے امکانات بہت پیچھے جا پڑے ہیں۔ یاد رکھئے! مذہبی پیشوائیت کا اقتدار

نظام سرمایہ داری کے ماپنے کا پیمانہ ہوتا ہے۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کے بڑھنے سے دوسری بڑھتی ہے اور ایک کے گھٹنے سے دوسری گھٹتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں دین کے انقلابی پروگرام کے راستے میں مزاحم ہوتی ہیں۔"

یہ کچھ انہوں نے جنوری ۱۹۶۱ء میں کہا تھا۔ اس دوران میں یہاں مذہبی پیشوائیت نے دین کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ زمانے کے تقاضوں نے نظام سرمایہ داری کے خلاف نفرت بیدار کی تو اس کے ردِ عمل کے طور پر کمیونزم اور سوشلزم کی نمود ہوئی۔ اس سے اس نظام کی عمارت کی بنیادوں میں تزلزل واقع ہوگیا اور مذہبی پیشوائیت کے تعویذ اسے سنبھال نہ سکے۔ اس کے بعد روس ناکام ہوا تو یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ کوئی ایسا نظام مستحکم نہیں ہو سکتا جس کی عمارت ابدی اقدارِ خداوندی پر استوار نہ ہو۔ اب چین کے انتشار نے اس حقیقت کو اور مؤثق کر دیا ہے۔ یہ تمام تجربات درحقیقت قرآنی نظام تک پہنچنے کے راستے ہموار کرتی جارہی ہیں۔ پاکستان میں اگر مذہبی پیشوائیت اس کا راستہ روک کر کھڑی نہ ہو جاتی تو یہاں کی فضا اس نظام کے قیام کے لئے بڑی سازگار تھی۔ بہرحال قرآنی نظام نے تو آخرالامر آکر رہنا ہے۔ دیکھیں یہ سعادت کس کے حصے میں آتی ہے ؟

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے — مسکیں دلکم ماندہ درایں کشمکش اندر!

بقیہ درس قرآن کریم صفحہ سے آگے۔

مردان میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
بر مکان ڈاکٹر رضا محمد خاں۔ نواب علی روڈ

جلال پور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ)
دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)

راولپنڈی
میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
جی ۱۶۶۔ لیاقت روڈ

ملتان میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)
دفتر شاہ سنز حرم گیٹ پاک گیٹ۔ (فون ۳۱۰۷۱)

لیہ (بذریعہ ٹیپ) ہر جمعہ بعد نمازِ مغرب
رہائش گاہ ڈاکٹر اظہر ملک صاحب سرکلر روڈ۔ لیہ

پنج کسی (تحصیل کبیر والا ضلع ملتان) میں ہر جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بوقت ۳ بجے شام
بمقام مطب حکیم احمد الدین صاحب
نمائندہ بزم طلوع اسلام

ضروری اعلان احباب کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی لمیٹڈ (۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور)

کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ اکیس احباب میں سے جن کو گزشتہ جون میں رجسٹرڈ چٹھی کے ہمراہ یکصد روپے کا ایک ایک چیک بمد واپسی حصص (SHARE MONEY) بھیجا گیا تھا، مندرجہ ذیل نو احباب کو (سوسائٹی کے ریکارڈ کے مطابق پتوں پر) ارسال کردہ چٹھیاں محکمہ ڈاک نے واپس بھیج دی ہیں :- (۱) سید شبیر احمد (۲) خان محمد اکبر خاں امامی (۳) نزہت اعجاز قادر علی (۴) رانا نعمت اللہ (۵) میاں محمد اسلم رانجھا (۶) حافظ محمد یونس صاحب (۷) ستیہ اشتیاق فاطمہ (۸) سیدہ شمشاد فاطمہ (۹) مسماۃ انجم واسطی۔ مذکورہ صدر احباب سے درخواست ہے کہ وہ اپنا موجودہ پتہ سوسائٹی ہذا کو تحریر فرمائیں تاکہ چیک مذکور ان کو دوبارہ ارسال کر دیئے جائیں۔

نقد و نظر

اُجالا

پاکستان آئی بینک سوسائٹی (کراچی) کا مجلّہ۔ بابت اپریل تا اکتوبر ۱۹۷۹ء

"آنکھوں والو! آنکھیں بڑی نعمت ہیں"

وہ کونسا قلبِ حساس ہے کہ کسی نابینا کی یہ صدائے دردناک سُن کر اس کا کلیجہ چھلنی نہ ہو جاتا ہو۔ لیکن آنکھوں والا (خدا سب کی آنکھیں محفوظ رکھے) اس کرب و اذیت اور یاس و حرماں کا کما حقہٗ اندازہ لگا ہی نہیں سکتا۔ جس میں ایک نابینا کی زندگی گذرتی ہے۔ آپ ذرا اپنے گھر میں پانچ سات منٹ تک آنکھیں بند کر کے چلئے پھریئے۔ اس سے آپ کو ان خارجی مسائل کا اندازہ ہو سکے گا جس سے نابینا دو چار ہوتا ہے۔ لیکن اس کے قلبِ حزیں پر کیا گذرتی ہے، اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے!

نابینائی کا بیشتر سبب قرنیہ (CORNEA) کی صلاحیت کا زائل ہو جانا ہے۔ اس نقص کا کوئی علاج آج تک دریافت نہیں ہو سکا۔ اس کا علاج، اس ماؤف قرنیہ کا صحیح قرنیہ سے بدل دینا ہی تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ کیمیاوی طور پر قرنیہ تیار نہیں ہو سکتا۔ تندرست قرنیہ کسی انسانی آنکھ ہی سے لیا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ کونسا انسان ہے جو جیتے جی اپنا قرنیہ دوسرے کو دے دے؟ آج سے کچھ عرصہ پہلے اس کا ایک حل دریافت کیا گیا۔ اور وہ یہ کہ اگر کسی شخص کے مرنے کے فوری بعد اس کی آنکھ کا قرنیہ نکال لیا جائے تو اسے کسی نابینا کی آنکھ میں پیوست کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس پر تجربہ کیا گیا۔ اور وہ کامیاب ثابت ہوا۔ اس طرح نابیناؤں کو ان کی چھنی ہوئی نعمت کی بازیابی کی شکل پیدا ہو گئی۔ اس کے بعد ایسے دردمند انسان سامنے آئے جنہوں نے یہ پیشکش کر دی کہ ان کی موت کے بعد ان کی آنکھوں کا قرنیہ نکال کر نابیناؤں کی آنکھ میں پیوست کر دیا جائے۔ سری لنکا کے حصّے میں یہ سعادت سب سے زیادہ آئی۔ وہاں سے سب سے زیادہ قرنیے دوسرے ملکوں کو عطیہ کے طور پر دیئے جاتے ہیں۔ کتنا بڑا احسان ہے نوعِ انسان پر ان "مخیّر" حضرات کا جو اس قدر بے بہا نعمت سے دوسروں کو نوازتے ہیں۔

پاکستان میں قریب انیس سال پہلے "آئی بینک سوسائٹی" کے نام سے اس مقصد کے لئے ایک ادارہ کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر محترم افتخار حسین صاحب کی سعیٔ پیہم سے "نہ صرف یہ کہ سری لنکا سے زیادہ سے زیادہ آنکھیں منگوا کر ہزاروں پاکستانیوں کو دوبارہ اس دنیائے رنگ و بو کو دیکھنے کے قابل بنا دیا گیا بلکہ تبلیغ اور ترغیب کے ذریعے کچھ آنکھیں مقامی ذرائع سے بھی حاصل کی گئیں جن سے ضرورت مند فیض یاب ہوئے ہیں۔" اس سوسائٹی کا ترجمان، زیرِ نظر مجلہ ہمارے پاس آیا تو ہم نے اسے بڑے شوق سے کھولا کہ اس میں اس "خیر الناس" اسکیم کے متعلق بیش بہا معلومات ملیں گی۔ اس میں معلومات تو ایک آدھ صفحہ میں ملیں اور باقی سارا پرچہ ان رکاوٹوں کو دور کرنے کی نذر ہو گیا جو اس کارِ خیر کے راستے میں کھڑی کی گئیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ اس

قسم کے زندگی بخش کام میں رکاوٹیں کن لوگوں کی طرف سے کھڑی کی جا سکتی ہیں؛ لیکن اس میں حیرت کی کونسی بات ہے۔ یہ رکاوٹیں انہی لوگوں کی طرف سے کھڑی کی گئیں جن کے خدا کا ارشاد ہے کہ وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۷) دنیا میں بقا اسی کام کے لئے ہے جو نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش ہو؛ یعنی مولوی صاحبان نے فتویٰ صادر فرما دیا کہ اس مقصد کے لئے آنکھوں کا عطیہ دینا شرعاً جائز نہیں۔ اس فتویٰ کی ابتدا مودودی (مرحوم) کی طرف سے ہوئی (رسائل و مسائل حصہ سوم مئی ۱۹۶۵ء ایڈیشن صفحہ ۲۹۷) اور اس کا اعادہ ان کے معاون ملک غلام علی صاحب نے کیا جس کا جواب طلوعِ اسلام کی طرف سے طلوعِ اسلام بابت مئی ۱۹۶۸ء (صفحہ ۴۱) میں شائع ہوا۔ اس کے بعد اس سوسائٹی کا بیشتر وقت، نابیناؤں کے لئے آنکھیں مہیا اور پیوست کرنے کے بجائے ان حضرات کے فتووں کے جوابات حاصل کرنے میں صرف ہو گیا۔ آج کل کا زیر نظر عبراسی "شرعی بحث" کی نذر ہے۔

ہم اس سوسائٹی کی خدمت میں اپنی طرف سے، اور دنیا بھر کے آنکھوں والوں کی طرف سے ہدیۂ مبارکباد پیش کرتے ہیں اور اہلِ پاکستان سے دردمندانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ ہر ممکن طریق سے اس کا ہاتھ بٹائیں۔ پتہ اس کا یہ ہے۔ پاکستان آئی بینک سوسائٹی۔ پانچویں منزل۔ جوبلی انشورنس ہاؤس۔ آئی۔ آئی۔ چندریگر روڈ۔ کراچی۔

ایک اور قرآنی شمع گُل ہو گئی..!

تشکیلِ پاکستان کے بعد جب یہاں قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلہ کا آغاز کیا گیا تو اس کی سب سے زیادہ شدید مخالفت سرحد کی چٹانوں سے ہوئی۔ لیکن مبداءِ فیض کی کرم گستری سے انہی چٹانوں سے چند ایک ایسے جری، بیباک اور باہمت مردانِ کار کی نمود ہوئی جنہوں نے مخالفوں کے اس ہجوم میں قرآنی شمع کو جلایا اور اس کی روشنی کو پھیلاتے چلے گئے۔ ان میں مردان کے دو بھائی، ڈاکٹر ٹی۔ ایم۔ خان (مرحوم) اور ڈاکٹر رضا محمد خان نمایاں تھے۔ اوّل الذکر کا کچھ عرصہ پہلے انتقال ہو گیا تو ثانی الذکر نے ان ذمہ داریوں کو تنہا اپنے اوپر لے لیا اور عبدالحکیم خان (مرحوم) کی وفات کے بعد، وہاں کی بزم کی نمائندگی کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے۔

اب یہ جگر خراش اطلاع ملی ہے کہ اواخر اکتوبر میں، ڈاکٹر رضا محمد خان کا بھی انتقال ہو گیا۔ جو بڑے صدمہ کا موجب ہے۔ اس سے تحریک کو بالعموم اور بزمِ مردان کو بالخصوص ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ادارہ اراکینِ بزمِ مردان، اور مرحوم کے پسماندگان کے ساتھ اس غم میں برابر کا شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں نشیمن عطا فرمائے۔

غم گسار

ناظم۔ ادارہ طلوع اسلام لاہور